قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

ماہنامہ ——— لاہور

خط وکتابت
ناظم ادارۂ طلوعِ اسلام (رجسٹرڈ)
۲۵/بی۔ گلبرگ ۲، لاہور ۱۱
پوسٹ کوڈ ———
ٹیلیفون : ۸۷۹۲۴۶

مجلسِ ادارت

مدیرِ مسئول : مرزا محمد خلیل
معاونین : ثریا عندلیب
محمد عمر دراز

ناشر : شیخ عبدالحمید
طابع : خالد منصور نسیم
مطبع : النور پرنٹرز و پبلشرز
۳/۲ فیصل نگر۔ ملتان روڈ۔ لاہور ۲۵
ٹیلیفون ——— ۲۷۵۸۲۶

مقامِ اشاعت : ۲۵/بی۔ گلبرگ ۲، لاہور ۱۱

فہرستِ مضامین

۱۔ لمعات۔ بدل کے بھیس زمانے میں پھر سے آتے ہیں۔ ۲
۲۔ هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ (محمد عمر دراز) ۱۰
۳۔ باب المراسلات۔ دسواں ترمیمی بل (محمد اسلام کراچی) ۱۶
۴۔ روئداد طلوعِ اسلام سب کنونشن منعقدہ ۱۰ر جون ۱۹۸۸ء ۱۷
مرتبہ محترم سراج منیر صاحب
۵۔ استقبالیہ سب کنونشن جون ۱۹۸۸ء (محمد عمر دراز) ۱۹
۶۔ اسلام اور جدید تصورِ قانون (محترم اعزاز الدین خان) ۲۶
۷۔ مذہبی فرقے (محترم خالد منصور نسیم) ۳۸
۸۔ فرقہ وارانہ ہم آہنگی (محترمہ ثریا عندلیب) ۴۲
۹۔ اہلِ حدیث علماء کا معیارِ تحقیق واخلاق مدیر طلوعِ اسلام ۴۶
۱۰۔ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت سے کیا مراد ہے؟ ۵۲
(محترم پرویزؒ صاحب)
۱۱۔ حقائق وعبر: جماعت اسلامی کا اپنی غلطیوں سے اغماض ۵۹
ii۔ ملت جعفریہ اور شیعہ قوم۔ یعنی چہ؟ iii۔ منہاج القرآن کا آغاز رسولؐ کے حکم سے؟ iv۔ ہندو مسلم شادیاں
۱۲۔ نقد ونظر۔ مظاہرِ فطرت اور قرآن ۶۴
۱۳۔ سر سید احمد خاں بحیثیت ایجوکیشنسٹ (انگریزی) ۸۰
(محترمہ شمیم انور)

جلد ۴۱ ——— اگست ۱۹۸۸ء ——— شمارہ ۸

بدل اشتراک
سالانہ
پاکستان ——— ۶۰ روپے
بیرونی ممالک ——— (بذریعہ سمندری ڈاک) ۱۲۵ روپے
فی پرچہ : -/۵ روپے

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

لمعات

بدل کے بھیس زمانے میں پھر سے آتے ہیں

قرآن کریم نے :-

۱- مذہبی پیشوائیت کے متعلق کہا کہ :-

اِنَّ کَثِیۡرًا مِّنَ الۡاَحۡبَارِ وَ الرُّہۡبَانِ لَیَاۡکُلُوۡنَ اَمۡوَالَ النَّاسِ بِالۡبَاطِلِ وَ یَصُدُّوۡنَ عَنۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ ..... ۝ (۹/۳۴)

"بلاشبہ علماء و مشائخ میں سے اکثر کی حالت یہ ہے کہ وہ جھوٹ اور فریب سے لوگوں کا مال ناحق کھا جاتے ہیں اور خدا کے راستے میں روک بن کر بیٹھ جاتے ہیں (کہ لوگ اس طرف نہ آئیں کیونکہ اس سے ان کی پیشوائیت اور اقتدار ختم ہو جاتے ہیں)"

۲- ملوکیت کے بارے میں ارشاد فرمایا کہ اُن کا طریق کار یہ ہوتا ہے کہ :-

..... اِنَّ الۡمُلُوۡکَ اِذَا دَخَلُوۡا قَرۡیَۃً اَفۡسَدُوۡہَا وَ جَعَلُوۡۤا اَعِزَّۃَ اَہۡلِہَاۤ اَذِلَّۃً ۚ وَ کَذٰلِکَ یَفۡعَلُوۡنَ ۝ (۲۷/۳۴)

"جب بادشاہ (لوگ) کسی بستی میں داخل ہوتے ہیں تو اُسے تہس نہس کر کے رکھ دیتے ہیں اور معاشرہ کا تختہ اس طرح اُلٹ دیتے ہیں کہ وہاں کے صاحبِ عزت اکابرین کو سب سے زیادہ ذلیل و خوار بنا دیتے ہیں۔ یہ بات کسی خاص بادشاہ سے متعلق نہیں، ملوکیت یہی کچھ کرتی ہے"۔

۳- نظامِ سرمایہ داری کے متعلق (جو قرآن کے معاشی نظام کی ضد ہے اور جس کے لئے اس نے ربٰو کی جامع اصطلاح استعمال کی ہے) کہا ہے کہ اس سے باز آجاؤ ورنہ خدا اور رسول کیطرف سے تمہارے خلاف اعلانِ جنگ ہے۔

فَاِنۡ لَّمۡ تَفۡعَلُوۡا فَاۡذَنُوۡا بِحَرۡبٍ مِّنَ اللّٰہِ وَ رَسُوۡلِہٖ ۚ ..... ۝ (۲/۲۷۹)

قارون کو نظامِ سرمایہ داری کے نمائندہ کے طور پر پیش کرتے ہوئے اس کے متعلق کہا کہ جب اُس سے کہا گیا کہ جس طرح اللہ نے تیرے ساتھ احسان کیا ہے، تو بھی اس کے بندوں کے ساتھ احسان کر اور اپنی دولت میں سے (اپنے لئے ہی سمیٹ کر رکھنے کی بجائے) ان کی ضروریات پورا کرنے کے لئے خرچ کر اور زمین میں فساد کا خواہش مند مت بن، تو اُس نے کہا کہ اس میں اللہ کے احسان کی کون سی بات ہے؟ یہ تو میں نے:-

.... اِنَّمَآ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰى عِلْمٍ عِنْدِيْ ..... ○ (۲۸/۷۸)

"اپنی ہنرمندی اور چابکدستی سے کمائی ہے"۔

جس کے جواب میں اُس سے کہا گیا کہ:-

بَلْ هِيَ فِتْنَةٌ ..... ○ (۳۹/۴۹)

"یہ اس کی کھلی ہوئی حماقت اور گمراہی ہے"۔

قرآنِ کریم نے بصراحت یہ بات بتا دی کہ یہ تینوں خود کوئی کام نہیں کرتے لیکن اپنی خون آشامیوں اور ہوس رانیوں کے لئے، محنت کرنے والے افراد کا استحصال کرتے ہیں اور انسانیت کے جسم سے خون کا آخری قطرہ تک نچوڑ لینے کے لئے آپس میں گٹھ جوڑ کرتے ہیں۔ اس طرح یہ ایک دوسرے کے دست و بازو اور ایک دوسرے کی قوت کا باعث بن کر رزق کے سرچشموں پر (جنہیں اللہ نے تمام انسانوں کی منفعت کے لئے بلا مزد و معاوضہ پیدا کیا ہے) قابض ہو جاتے ہیں اور انسانوں کو نانِ جویں تک کے لئے اپنا محتاج بنا لیتے ہیں۔ انسانوں کی، اپنی روٹی کے لئے اس محتاجی کے واسطے، یہ انہیں اپنا محکوم بنا لیتے ہیں اور ان سے اپنے من مانے احکام کی اطاعت کراتے ہیں۔

یہ تھے وہ اطواق و سلاسل جن سے محکوم انسانوں کی گردنیں آزاد کرانے کے لئے اللہ کے رسول علیہم السلام آتے رہے۔ اس سلسلہ زرّیں کی آخری کڑی حضور نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا مقصد قرآن کریم نے یہ بتایا کہ:-

..... وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ ..... (۷/۱۵۷)

وہ (مذہبی پیشواؤں کے جن خود ساختہ آئین و شرائع اور مستبد حکام کے جور و ستم کے جس بوجھ کے نیچے انسانیت دبی چلی آ رہی تھی، اُس بوجھ کو اُس کے سر سے اُتارتا ہے اور (تقلید و اوہام کی جن زنجیروں میں انسانی قلب و دماغ جکڑا ہوا تھا) ان زنجیروں کو توڑتا ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا نظام قائم کیا کہ دنیائے انسانیت نے دیکھ لیا کہ جب مذہبی پیشوائیت کے خودساختہ آئین و شرائع کی جگہ اللہ کے قوانین کی اطاعت کی جائے تو شرفِ انسانیت کس طرح پھلتا پھولتا اور پروان چڑھتا ہے۔ لیکن آپؐ اور آپؐ کے خلفائے راشدینؓ کی تشریف براری کے بعد، یہ گروہ پھر آگے بڑھے اور (جیسا کہ آپؐ سے پہلی اُمتوں کے ساتھ ہوتا رہا تھا) اس نظامِ خداوندی کی جگہ اپنے خودساختہ اور مفاد پرستانہ نظام کو لے آئے جس میں یہ رزق کے سرچشموں پر قبضہ کرکے انسانوں کو اپنا محکوم بنا لیتے ہیں۔ اس کے لئے یہ وہی تکنیک استعمال کرتے ہیں جسے قرآن کریم کے مطابق، ملوکیت کے نمائندہ، فرعون نے اپنا رکھا تھا یعنی محکوم قوم کو مختلف پارٹیوں میں تقسیم کرکے کبھی ایک کو عزت و توقیر بخشی (اور جب دیکھا کہ وہ اتنے طاقت ور ہو رہے ہیں کہ میرے اقتدار کے لئے خطرہ بن سکتے ہیں تو انہیں ذلیل و خوار کیا اور) کبھی دوسرے کو مقرب بنایا۔ قرآن کریم کے الفاظ میں:-

اِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِی الْاَرْضِ وَجَعَلَ اَهْلَهَا شِيَعًا يَّسْتَضْعِفُ طَآئِفَةً مِّنْهُمْ يُذَبِّحُ اَبْنَآءَهُمْ وَيَسْتَحْيٖ نِسَآءَهُمْ ۭ اِنَّهٗ كَانَ مِنَ الْمُفْسِدِيْنَ (۲۸/۴)

"واقعہ یہ تھا کہ فرعون نے اپنی مملکت میں بڑی سرکشی اختیار کر رکھی تھی اس نے اپنی قوت کو مستحکم رکھنے کے لئے ملک کے باشندوں کو مختلف پارٹیوں میں تقسیم کر رکھا تھا، اور ان میں سے ایک پارٹی کو کمزور سے کمزور تر کرتا چلا جاتا تھا۔ اس لئے کہ اس کی پالیسی یہ تھی کہ وہ اس قوم کے ان افراد کو جن میں اُسے جوہرِ مردانگی نظر آتے، ذلیل و خوار کرکے غیر مؤثر بنا دیتا اور جو اُن جوہروں سے عاری ہوتے، انہیں اُبھارتا اور آگے بڑھاتا رہتا۔ اس طرح وہ اس قوم کے اندر ناہمواریاں پیدا کرکے، ان کی قوت کو توڑتا چلا جاتا۔"

انسانیت اسی ابلیسی نظام کے تحت زندگی بسر کرتی چلی آ رہی تھی کہ ہمارے زمانے میں بانیانِ پاکستان علیہم الرحمۃ نے اسے ان اطواق و سلاسل سے آزادی دلانے اور پھر سے اللہ کے عطا کردہ قانون (قرآنِ عظیم) کے مطابق نظامِ حکومت قائم کرنے کے لئے پاکستان کا مطالبہ پیش کیا۔

بانیٔ پاکستان حضرت قائدِ اعظم محمد علی جناحؒ نے پاکستان کی جدوجہد کا آغاز کرنے کے ساتھ ہی بآہنگِ بلند اس امر کا اظہار بار بار کیا کہ جس مملکت کے حصول کو انہوں نے اپنی زندگی کا گوہرِ مقصود ٹھہرایا ہے، اُس میں ملوکیت، مذہبی پیشوائیت اور سرمایہ داری کے لئے کوئی جگہ نہیں ہوگی مثلاً:-

۱۹۴۱ء میں حیدرآباد دکن کی عثمانیہ یونیورسٹی کے طلبا نے آپ سے پوچھا کہ جب آپ اسلامی اصول کے نصب العین اور طریق کار، دونوں میں بہترین حکومت کا یقین رکھتے ہیں اور اجمالاً یہ بھی کہتے ہیں کہ

مسلمانوں کو خود مختار علاقے اس لئے مطلوب ہیں کہ وہاں وہ اپنے ذہنی میلانات اور تصورِ زندگی کو بلا روک ٹوک بروئے کار لا سکیں تو پھر اس میں کونسا امر مانع ہے کہ مسلم لیگ زیادہ تفصیل اور توضیح کے ساتھ اپنی جدّوجُہد کی مذہبی تعبیر و تشریح کر دے۔ تو آپ نے جواباً فرمایا کہ :-

"وقت یہ ہے کہ جب اس جدّوجُہد کو مذہب سے تعبیر کیا جائے تو ہمارے علماء کی ایک جماعت، بغیر اس بات کو سمجھنے کے کہ کام کی نوعیت، تقسیم عمل اور اس کے اصلی حدود کیا ہیں، **ان امور کو چند مولویوں کا اجارہ خیال کر لیتی ہے** اور اپنے حلقہ سے باہر، اہلیت و استعداد کے باوجود، مجھ میں یا آپ میں (یعنی اپنے سوا کسی دوسرے میں) اس خدمت کے سرانجام دینے کی کوئی صورت نہیں دیکھتی حالانکہ اس منصب کی بجا آوری کے لئے جن اجتہادی صلاحیتوں کی ضرورت ہے، انہیں میں، ان مولوی صاحبان میں (اِلّاماشاءاللہ) نہیں پاتا اور (مشکل اندر مشکل یہ کہ) **وہ اس مشن کی تکمیل میں دوسروں کی صلاحیتوں سے کام لینے کا سلیقہ بھی نہیں رکھتے۔"**

(عثمانیہ یونیورسٹی کے طلباء سے انٹرویو بحوالہ اورینٹ پریس)

اس باب میں، حضرت قائداعظم علیہ الرحمۃ اور مفکرِ پاکستان، حضرت علامہ اقبالؒ مکمل طور پر اتفاق رکھتے تھے۔ قائداعظمؒ کا جواب آپ نے پڑھ لیا۔ اب دیکھئے علامہ اقبالؒ اس بارے میں کیا کہتے ہیں۔ انہوں نے فرمایا کہ :-

قوم کیا چیز ہے، قوموں کی امامت کیا ہے اسے کیا جانیں یہ بے چارے دو رکعت کے امام

انہوں نے اس موضوع پر اتنا کچھ کہا ہے کہ اس حقیقت کے سمجھنے میں کوئی ابہام نہیں رہتا کہ ہمارا یہ طبقہ امورِ مملکت سرانجام دینے کے کسی طرح بھی اہل نہیں۔

پاکستان بننے کے بعد، قائداعظمؒ نے ساری دنیا سے برملا کہہ دیا کہ مملکتِ پاکستان میں تھیاکریسی ہرگز ہرگز رائج نہیں ہو گی چنانچہ انہوں نے فروری ۱۹۴۸ء میں بہ حیثیت گورنر جنرل پاکستان، اہلِ امریکہ کے نام اپنے براڈکاسٹ میں کہا کہ :-

"پاکستان کا نسٹی ٹیوئنٹ اسمبلی نے ابھی پاکستان کا آئین مرتب کرنا ہے۔ میں نہیں جانتا کہ اس آئین کی آخری شکل کیا ہو گی لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ اسلام کے بنیادی اصولوں کا آئینہ دار، جمہوری انداز کا ہو گا۔ اسلام کے یہ اصول آج بھی اسی طرح عملی زندگی پر منطبق ہو سکتے ہیں جس طرح وہ تیرہ سو سال پہلے ہو سکتے تھے اسلام نے ہمیں وحدتِ انسانیت

اور ہر ایک کے ساتھ عدل و دیانت کی تعلیم دی ہے آئینِ پاکستان کے مرتب کرنے کے سلسلہ میں جو ذمہ داریاں اور فرائض ہم پر عائد ہوتے ہیں، ان کا ہم پورا پورا احساس رکھتے ہیں کچھ بھی ہو، **یہ مسلمہ بات ہے کہ پاکستان میں کسی صورت میں بھی تھیاکریسی رائج نہیں ہوگی۔** جس میں حکومت مذہبی پیشواؤں کے ہاتھ میں دے دی جاتی ہے کہ بزعم خویش وہ خدائی مشن کو پورا کریں۔" (تقاریر بحیثیت گورنر جنرل ص۶۵)

یہ تھے قائدِ اعظم علیہ الرحمۃ کے خیالات اور عزائم ہماری مذہبی پیشوائیت کے بارے میں۔ چونکہ یہ مذہبی پیشوا جانتے تھے کہ قائداعظمؒ کے پاکستان میں ان کے لئے کوئی جگہ نہیں ہوگی اس لئے اس سے قطع نظر کہ قائداعظمؒ ایک ایسی مملکت کے حصول کے لئے کوشاں ہیں جس میں قرآنی احکام و اصول کی حکمرانی ہوگی، (صرف اس لئے کہ اس نظامِ مملکت میں انہیں کوئی مقام حاصل نہیں ہوگا) قائدِ اعظمؒ کے خلاف متحدہ محاذ بنا کر کھڑے ہو گئے **اور ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا کہ یہ مملکت وجود میں نہ آئے۔**

قرآنِ کریم کا جو معاشی نظام قائداعظمؒ کے ذہن میں تھا اس کے نقوش کی انہوں نے سٹیٹ بنک آف پاکستان کا افتتاح کرتے ہوئے جولائی ۱۹۴۸ء میں یوں وضاحت فرمائی:-

"ہمارے پیشِ نظر مقصد یہ ہے کہ یہاں کے عوام خوش حالی اور اطمینان کی زندگی بسر کر سکیں۔ اس مقصد کا حصول، مغرب کے اقتصادی نظام کو اختیار کرنے سے کبھی نہیں ہو سکتا۔ ہمیں اپنا راستہ آپ متعین کرنا چاہیئے اور دنیا کے سامنے ایک ایسا نظام پیش کرنا چاہیئے جو انسانی مساوات اور عدلِ عمرانی کے اسلامی تصورات پر مبنی ہو۔ صرف یہی وہ طریق ہے جس سے ہم اس فریضہ سے عہدہ برآ ہو سکیں گے جو ہم پر مسلمان ہونے کی حیثیت سے عائد ہوتا ہے اور ہم دنیا کو وہ پیغام دے سکیں گے جو اسے تباہیوں سے بچا لے گا اور نوعِ انسان کی بہبود و مسرت اور خوش حالی کا ضامن ہو سکے گا یہ کسی اور نظام سے نہیں ہو سکتا۔"

لیکن ظاہر ہے کہ جاگیرداری، زمینداری اور سرمایہ داری کی موجودگی میں، اسلام کا یہ معاشی نظام قائم نہیں ہو سکتا۔ تحریکِ پاکستان کے دوران، ملک کے بڑے بڑے زمیندار اور سرمایہ دار، مسلم لیگ کے ساتھ تھے لیکن قائدِ اعظمؒ انہیں کسی دھوکے میں نہیں رکھنا چاہتے تھے کہ حصولِ پاکستان کے بعد ان کی پوزیشن کیا ہوگی۔

انہوں نے تشکیلِ پاکستان سے بہت پہلے ۲۴ اپریل ۱۹۴۳ء کو آل انڈیا مسلم لیگ دہلی کے اجلاس میں برملا اعلان کر دیا کہ :-

"اس مقام پر میں زمینداروں اور سرمایہ داروں کو بھی متنبہ کرنا چاہتا ہوں۔ وہ ایک ایسے فتنہ انگیز ابلیسی نظام کی رُو سے، جو انسان کو ایسا بدمست کر دیتا ہے کہ وہ کسی معقول بات کے سننے پر آمادہ ہی نہیں ہوتا، عوام کے گاڑھے پسینے کی کمائی پر رنگ رلیاں مناتے ہیں۔ عوام کی محنت کو غصب کر لینے کا جذبہ اُن کے رگ و پے میں سرایت کر چکا ہے .... میں اکثر دیہات میں گیا ہوں۔ وہاں میں نے دیکھا ہے کہ لاکھوں خدا کے بندے ایسے ہیں جنہیں ایک وقت بھی پیٹ بھر کر روٹی نہیں ملتی۔ کیا اسی کا نام تہذیب ہے؟ کیا یہی پاکستان کا مقصد ہے؟ اگر پاکستان کا یہی مقصد ہے تو میں ایسے پاکستان سے باز آیا! اگر ان سرمایہ داروں کے دماغ میں ہوش کی ذرا سی بھی رمق ہے تو انہیں زمانے کے بدلتے ہوئے تقاضوں کے ساتھ چلنا ہوگا۔ اگر انہوں نے ایسا نہ کیا تو ان کا خدا حافظ! ہم ان کی کوئی مدد نہیں کر سکتے۔"

قائداعظمؒ نے ایک بار نہیں، بار بار اپنے اس عزم کا اعادہ کیا کہ پاکستان میں آئین کی بنیاد، صرف اور صرف قرآنِ کریم کے احکام ہوں گے اور اس نظامِ مملکت میں نہ تو مذہبی پیشوائیت کے لئے کوئی جگہ ہوگی اور نہ ہی اس میں سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کو کوئی عمل دخل حاصل ہوگا۔

لیکن اپنا خونِ جگر دے کر، ہمارے لئے ایک آزاد مملکت حاصل کرنے والے قائدِاعظمؒ کی عمر نے وفا نہ کی کہ وہ اس مملکت کو وہ آئین دے جاتے جو اُن کا محبوبِ نظر تھا اور ہمارا یہ حسین خواب (کہ ہم اس مملکت میں اللہ کے قانون کو سرفراز اور سربلند کریں گے) شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا۔ بلکہ وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ یہ منتشر ہوتا چلا گیا۔

پاکستان حاصل کرنے والے السابقون الاوّلون کے بعد آنے والے پاکستان کے حکمرانوں نے ایسی پالیسیاں اختیار کیں جن کے نتیجہ میں وہی سرمایہ داری، اور مذہبی پیشوائیت، جن سے اُمت کی گلو خلاصی کرانے کے لئے پاکستان حاصل کیا گیا تھا، بتدریج زور پکڑتی گئی۔ اُن کے باہمی گٹھ جوڑ نے اب تک اس مملکت میں قرآن کی حکمرانی قائم کرنے کی کوششوں کو ناکام بنائے رکھا ہے اور دوسری طرف یہ ایسے قوانین وضع اور رائج کرانے میں اپنی ساری توانائیاں صرف کر رہے ہیں جن کے ذریعہ مذہبی پیشوائیت آہستہ آہستہ آگے بڑھتی رہے اور آخر الامر اسلام کے نام پر اپنی خود ساختہ شریعت قوم پر ٹھونس دے کیونکہ جہاں ملوکیت اور سرمایہ داری مذہبی پیشوائیت کے سرپرست بنتے ہیں وہیں مذہبی پیشوائیت ان دونوں

طبقوں کے وجود کے جواز کے فتوے مہم پہنچاتی ہے۔

آج ہم پھر، ایسے تاریخ ساز دوراہے پر آ کھڑے ہوئے ہیں، جہاں ہم قرآن کریم کا عطا کردہ "الاسلام" بھی اس مملکت کا ضابطۂ آئین بنا سکتے ہیں جس میں خالصتہً قرآنی احکام و اصول کی حکمرانی ہو اور جس میں مذہبی پیشوائیت آمریت اور سرمایہ داری کے لئے تو کوئی جگہ نہیں ہوتی لیکن جس میں انسانیت سکھ کا سانس لیتی اور چین کی نیند سوتی ہے۔ اور اس طرح زمانے کی امامت کے مستحق بن سکتے ہیں ــــ اور ــــ اس کے برعکس اگر مذہبی پیشوائیت آمریت اور سرمایہ داری کا گٹھ جوڑ کامیاب ہو جائے، تو یہاں، مذہبی پیشوائیت کی خود ساختہ شریعت بھی نافذ ہو سکتی ہے جس میں یہ گروہ تو خوب پھلتے پھولتے ہیں لیکن انسانیت کی ہڈیاں ٹوٹ جاتی ہیں۔

اس دوراہے پر، گویہ ذمہ داری پوری قوم کی ہے، لیکن سب سے اہم ذمہ داری، محترم صدرِ مملکت کے سر آپڑتی ہے۔ وہ چاہیں تو قانونِ الٰہی (قرآن کریم) کو سرفراز اور سربلند کر کے، اپنے ساتھ ایسا نامۂ اعمال لے کر اللہ کے حضور جائیں جو نہ صرف اس کے نزدیک قابلِ قبول ہو گا بلکہ قابلِ تحسین بھی ہو گا۔

اگر محترم صدرِ مملکت اپنے لئے ایسا طریقِ کار اختیار کرنا چاہیں (اور انہیں ایسا کرنا چاہیئے) تو اس کے لئے انہیں سب سے پہلے، بانیٔ پاکستان قائدِ اعظمؒ کے "تتبع" میں، اس امر کا اعلان کرنا ہو گا کہ:-

مملکتِ پاکستان کا تمام کاروبار، قرآنِ کریم کے مطابق ہو گا۔

اس کے بعد باقی امور مندرجہ ذیل طریق پر طے پا سکیں گے:-

(۱) قرآنِ کریم میں کچھ احکام و قوانین، متعین شکل میں دیئے گئے ہیں اور بعض اقدار، اصول کے طور پر بیان ہوئی ہیں۔ قرآن کے احکام و قوانین ہوں یا اصول و اقدار، سب غیر متبدل ہیں اور تمام مسلمانوں پر ہمیشہ کے لئے نافذ العمل رہنے کے لئے دی گئی ہیں۔

(۲) جن اقدار کے لئے صرف اصول دیئے گئے ہیں، مملکت کے اربابِ فکر و نظر ــــ نمائندگانِ ملت (اُمت کی منتخب مقننہ) ان اصولوں کی روشنی میں، اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق، انکے جزئی قوانین مرتب کریں۔ ایسا کرنے میں وہ احادیث، تاریخ، فقہ کو اپنے سامنے رکھیں اور ان سے فائدہ اٹھاتے ہوئے، اپنے زمانے کی ضروریات کے مطابق قوانین مرتب کریں جو کچھ پیچھے سے چلا آ رہا ہے، اس میں جو قوانین ایسے ہوں جو قرآنی اصولوں کے مطابق ہیں اور جو ہمارے زمانے کی ضروریات کو پورا کرتے ہیں انہیں ویسے ہی رہنے دیا جائے جن میں تبدیلی کی ضرورت

ہو۔ ان میں تبدیلی کر لی جائے۔ جہاں نئے قانون کی ضرورت ہو، نیا قانون بنا لیا جائے۔ اسطرح قرآن کے اصول غیر متبدل رہیں گے اور ان کے اندر وضع کردہ قوانین زمانے کی ضرورتوں کے ساتھ ساتھ بدلتے جائیں گے۔ یوں مستقل اور قابلِ تغیّر و تبدّل عناصر کے حسین امتزاج سے، کاروانِ ملّت آگے بڑھتا چلا جائے گا۔

(۳) دین کا مقصد، انسان کے، اس دنیا کے معاملات کو اس طرح حل کرنا ہے کہ اس سے وہ فساد دناہمواری) ختم ہو جائے جس کی وجہ سے افراد اور قوم اس بُری طرح جہنّم کے عذاب میں گرفتار ہیں اور اس کے ساتھ ہی افراد کی ذات کی نشوونما اس طرح ہوتی جائے کہ وہ موت کے بعد بھی زندگی کی ارتقائی منازل طے کرنے کے قابل ہو جائے۔ اگر ہمارا نظام اس قسم کے نتائج پیدا کرتا ہے تو وہ صحیح اسلامی ہے۔ اگر اس سے یہ نتائج مرتب نہیں ہوتے تو ہمیں سمجھ لینا چاہیئے کہ اس میں کہیں خرابی ہے۔ اس خرابی (یا خرابیوں) کا سراغ ہمیں قرآنِ کریم کی روشنی میں مل سکتا ہے ہماری کوششوں سے مقصود یہ ہونا چاہیے کہ ہم ان خرابیوں کا ازالہ کر کے، دین کے نظام کو انہی خطوط پر متشکل کر سکیں جن پر یہ حضور رسالتمآبؐ کے عہد مبارک میں استوار ہوا تھا۔

ماہنامہ طلوعِ اسلام کا تازہ سالانہ چندہ اور ترسیل بذریعہ ہوائی ڈاک کی نئی شرح

۱۔ اندرونِ ملک پاکستان -/۶۰ روپے　　غیر ممالک بذریعہ بحری ڈاک -/۱۲۵ روپے

۲۔ غیر ممالک بذریعہ ہوائی ڈاک

(i) ایران، عراق، مصر اور بنگلہ دیش -/۱۶۰ روپے

(ii) عرب امارات، لبنان، یمن، کویت، سعودی عرب، سری لنکا، جزائر مالدیپ وغیرہ -/۱۸۵ روپے

(iii) انڈیا، برما، لیبیا، کینیا، یوگنڈا، جنوبی افریقہ وغیرہ -/۲۰۰ روپے

(iv) یورپ کے ممالک برطانیہ، ناروے، فرانس وغیرہ -/۲۰۰ روپے

(v) جنوب مشرقی الیشائی ممالک (فلپائن، سنگاپور، ملائیشیا، جاپان وغیرہ) -/۲۰۰ روپے

(vi) امریکہ، کینیڈا، نیوزی لینڈ، آسٹریلیا، جزائر فجی وغیرہ -/۲۵۰ روپے

۳۔ مذکورہ بالا چندہ میں خرچ ڈاک شامل ہے۔ البتہ جو خریدار پرچہ بذریعہ رجسٹری منگوانا چاہیں انکی طرف سے فیس رجسٹری (-/۳ روپے فی پرچہ) علیحدہ ادا کرنا ہوگا۔ والسلام

محمد عمر دراز

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُونَ!

"وہ قرآن، ان تمام اشیاء سے بہتر ہے جسے انسان اکٹھا کرتے رہتے ہیں۔"

خالقِ کائنات نے انسان کو پیدا کیا تو ساتھ ہی اس کی ضروریاتِ زندگی وافر مقدار میں زمین پر پھیلا دیں۔

اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ ثُمَّ رَزَقَكُمْ ..... (۳۰/۴۰)

"اللہ وہ ہے جس نے تمہیں پیدا کیا اور پھر تمہارے لئے رزق بھی مہیا کیا۔"

اور اس سے کہہ دیا کہ:

وَقُلْنَا يٰٓاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا ۪ وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۝ (۲/۳۵)

"اور ہم نے کہا کہ اے آدم، تم اور تمہاری رفیقۂ حیات اس جنتِ (ارضی) میں (امن اور چین سے) رہو اور جہاں سے، جتنی ضرورت ہو، کھاؤ پیو۔ اور مشاجرت (یعنی باہمی تفریق اور میری تیری کے جھگڑے) اختیار نہ کرنا۔ (اگر تم نے باہمی اختلافات شروع کر دیئے تو یہ جنتِ زندگی (جس میں ہر ایک کے لئے اس کی ضروریات سے کہیں زیادہ سامانِ زیست موجود ہے (۵۱/۳۵) تم سے چھن جائے گی اور تم (زندگی کے بلند مقاصد تو ایک طرف، سامانِ زیست کے حصول کے لئے بھی جانکاہ مشقتوں میں مبتلا ہو جاؤ گے (۲۰/۱۱۷) اور پھر تم خود اپنے ہاتھوں اپنے آپ پر زیادتی کر کے بیٹھو گے۔"

آدم نے وہی کیا جس سے اسے روکا گیا تھا۔ اس کے مفاد پرستانہ جذبات اس پر غالب آ گئے اور اس نے طاقت کے بل بوتے پر، دھاندلی سے، رزق کے سرچشموں کو اپنے لئے سمیٹنا شروع کر دیا۔ جس سے اس کے دوسرے ہم جنس اپنی روٹی تک کے لئے محتاج ہو گئے۔ جب اس طرح اس نے اپنے ہاتھوں، اپنی جنتِ ارضی کو جہنم میں تبدیل کر لیا اور اپنی روٹی کے لئے اسے جانکاہ مشقتوں کا سامنا کرنا پڑا تو اس نے اللہ کی طرف رجوع کرتے ہوئے عرض کی کہ:

قَالَا رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا ۫ وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ۝ (۷/۲۳)

"انہوں نے (مرد اور عورت نے) کہا اے ہمارے نشوونما دینے والے، ہم نے اپنے آپ پر ظلم کیا جو تیری بات نہ مانی، اور اگر آپ کی طرف سے ہماری حفاظت اور مرحمت کا انتظام نہ ہوا تو ہم تباہ و برباد ہو جائیں گے"

چونکہ انسان کو ایک مقررہ مدت تک اس دنیا میں رہنا ہے اور اسے ایسی حالت میں چھوڑا نہیں جا سکتا تھا لہٰذا اللہ تعالیٰ کی طرف سے اسے جواب ملا کہ چونکہ تم اپنے کئے کی ذمہ داری قبول کرتے ہو، اس لئے تمہاری اصلاح ممکن ہے۔ اس کا طریق کار یہ ہو گا کہ:۔

..... فَإِمَّا يَأْتِيَنَّكُم مِّنِّي هُدًى فَمَن تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ۝ (۲/۳۸)

"جب میری طرف سے ہدایت آئے تو جو کوئی بھی اس ہدائیت کا اتباع کرے گا۔ اسے کسی قسم کا خوف و حزن نہ ہو گا"

اس طرح انسانیت کو اس کے اپنے پیدا کردہ جہنم سے نکال کر پھر سے جنتی زندگی دینے کے لئے، اللہ کی طرف سے سلسلۂ رشد و ہدایت شروع کیا گیا۔ اللہ کے یہ جلیل القدر مرسلین علیہم التحیہ والسلام آتے اور پھر سے انسانوں کے خود ساختہ نظام ہائے باطل کو، اللہ کے عطا کردہ نظام حیات (دین) سے بدل کر ان کی زندگی کو جنت کی نعمتوں سے آشنا کراتے۔ لیکن ان کی تشریف براری کے بعد انسان اس نظام زندگی میں جسے اللہ کے رسولؑ نافذ کرتے، پھر سے اپنی مفاد پرستانہ آمیزشیں کر کے (اللہ کی کتاب کے ساتھ، اپنی خود ساختہ شریعت ملا کر) اس نظام کو بدل ڈالتے اور اس طرح ان نعمتوں سے محروم ہو جاتے۔ جو دین کے نظام کے تحت زندگی گذارنے کا فطری نتیجہ ہوتی ہیں۔

يَكْتُبُونَ الْكِتَابَ بِأَيْدِيهِمْ ثُمَّ يَقُولُونَ هَٰذَا مِنْ عِندِ اللَّهِ (۲/۷۹)

"(ان کے علماء) اپنے ہاتھوں سے اپنی مرضی کے مطابق کتابیں لکھ کر (شریعت کے احکام وضع کر کے) کہتے کہ یہ اللہ کی طرف سے آیا ہے"

تاکہ اس سے کچھ فائدہ حاصل کر لیں:

لِيَشْتَرُوا بِهِ ثَمَنًا قَلِيلًا ... ۲/۷۹

یہ سلسلہ یونہی چلتا رہا اور ایک کے بعد، دوسرا رسولؑ، مختلف اقوام کی طرح آتا رہا اور انہیں مقامی حالات کے مطابق 'دین' کے راستے پر چلاتا رہا۔ تاآنکہ جب اللہ کی مشیت کے پروگرام کے مطابق انسانیت اس قابل ہو گئی کہ اب یہ انسانوں کے سہاروں کے بغیر، دساتیر و اصول پر چل کر اپنی زندگی

سنوار سکتی تھی تو اسے ایک مستقل، غیر متبدل اور محفوظ ضابطۂ حیات دینے کے لئے آخری رسول صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور اپنے ساتھ دنیائے انسانیت کے لئے وہ ضابطۂ زندگی لائے جس کے متعلق اس کے عطا کرنے والے نے کہا کہ یہ:

وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا ۵

"اس قرآن میں اللہ کا ضابطۂ قوانین تمام صداقتوں کو اپنے اندر لئے اور عدل و توازن کے تمام تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے مکمل ہو چکا ہے"

لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ ..... (۶/۱۱۵)

"اب ان قوانین (کلمات اللہ یعنی قرآن) کو کوئی بدل نہیں سکتا"

اور یہ اس لئے کہ:

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ۵ (۱۵/۹)

"ہم نے ہی اس قرآن کو نازل کیا ہے اور اسے (انسانی تحریف، دست برد ... آسمانی اور ارضی حوادث سے) محفوظ رکھنا بھی ہماری ہی ذمہ داری ہے"

یہ ایک ایسا قابلِ عمل، ضابطۂ حیات ہے۔ جو ان تمام نظامہائے زندگی سے بہتر اور افضل ہے جسے دنیائے انسانیت کے تمام تر دانشور مل کر بنا سکیں۔ انسانیت کو ایسے ضابطۂ حیات کا مل جانا، محض اور محض اللہ کے فضل و رحمت سے ممکن ہوا اور نہ یہ انسانیت کے بس کی بات ہی نہ تھی کہ وہ اسے کہیں سے بھی حاصل کر سکے۔ ارشادِ خداوندی ہے:

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَشِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ ۙ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ۵ (۱۰/۵۷)

"اے نوعِ انسان! تمہارے نشوونما دینے والے کی طرف سے ایک ایسا ضابطۂ حیات آگیا ہے جس میں ہر اُس کشمکش کا علاج ہے جو تمہارے دلوں کو وقفِ اضطراب رکھتی ہے اور جو ہر اُس قوم کی، جو اسے اپنا ضابطۂ حیات تسلیم کر لیتی ہے، کامیابیوں کی طرف راہنمائی کر دیتا ہے اور انہیں سامانِ نشوونما سے بہرہ یاب کر دیتا ہے"

قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا ۵

"ان سے کہو کہ اس قسم کے ضابطۂ ہدایت کا مل جانا (فقط) خدا کے فضل و رحمت سے ہے، (تم اسے کسی قیمت پر حاصل نہ کر سکتے تھے) پس تمہیں چاہیئے کہ اس کے ملنے

پر جشنِ مسرت مناؤ۔"

اس لئے جشنِ مسرت مناؤ کہ

هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُونَ ۝ (۱۰/۵۸)

"یہ (ضابطۂ ہدایت) تمام اندوختۂ علمِ انسانی اور اس کی جملہ کاوشوں کے ماحصل سے زیادہ گراں بہا ہے۔"

یہ بات گہرے غور و فکر کی متقاضی ہے جو اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ اسکا عطا کردہ ضابطۂ ہدایت (القرآن الکریم) تمام اندوختۂ علم انسانی اور اسکی جملہ کاوشوں کے ماحصل سے بہتر ہے۔

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو صرف قرآن ہی کی تعلیم دی گئی تھی۔

اَلرَّحْمٰنُ ۝ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ ۝ (۵۵/۱-۲)

"خدائے رحمٰن نے قرآن کی تعلیم دی۔"

اور آپؐ نے اسی ضابطۂ ہدایت کے مطابق نظامِ مملکت تشکیل فرمایا۔ اور آپؐ کے خلفائے راشدینؓ نے اسی ضابطۂ ہدایت کے مطابق اس نظامِ مملکت کو پروان چڑھایا۔

آپؐ کے قائم کردہ نظامِ مملکت کے نتیجہ کے طور پر امن و سکون کی یہ حالت تھی کہ آپؐ کے ارشاد کے مطابق "ایک عورت، زیورات میں لدی ہوئی، تن تنہا شام سے چل کر، جنگلوں اور صحراؤں میں سفر کرتی چلی جاتی اور اسے اللہ کے سوا کسی کا خوف نہ ہوتا۔"

اس نظام کے ثمرات کو دنیائے انسانیت نے اپنی آنکھوں سے دیکھا اور یہ حقیقتِ ثابتہ ان کے سامنے آگئی کہ جب انسانی ہیئتِ اجتماعیہ کی تشکیل، خالصتہً اس ضابطۂ زندگی کے مطابق ہوتی ہے جس کے متعلق اللہ کا ارشاد ہے کہ وَهُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُونَ، تو اللہ کا یہ وعدہ کسطرح پورا ہوتا ہے کہ۔

وَاَشْرَقَتِ الْاَرْضُ بِنُوْرِ رَبِّهَا ۝ (۳۹/۶۹)

"اور یہ زمین اپنے نشوونما دینے والے کے نور سے جگمگا اٹھتی ہے۔"

لیکن آپؐ اور آپؐ کے خلفائے راشدینؓ کی تشریف براری کے بعد (اللہ کے اس واضح ارشاد کیخلاف کہ یہ ضابطۂ ہدایت (قرآن) ہر اُس شے سے بہتر ہے جسے یہ لوگ جمع کرتے ہیں) انسانوں نے اس ضابطۂ ہدایت کو پسِ پُشت ڈال دیا اور اس سے باہر دوسری چیزوں کو اکٹھا کرنا شروع کر دیا۔ اور اپنی ان خود ساختہ کتابوں کے مطابق چل پڑے۔ آج آپ کو جو اس قسم کی آوازیں سنائی دیتی ہیں

کہ قرآن مکمل ضابطۂ زندگی نہیں اور صرف قرآن کے احکامات کے مطابق نظامِ حیات متشکل نہیں پاسکتا تو یہ اللہ کے اسی ارشاد کی نفی اور تکذیب ہے کہ:-

هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُونَ

ہماری زندگی اسی لئے جہنم زار بن رہی ہے اور ہم اسی لئے اپنی ہم عصر اقوام میں پست تر اور ان کے مقابل ذلیل و خوار ہیں۔ کہ ہم اللہ کے ارشادات اور اس کے عطا کردہ ضابطۂ زندگی کی نفی اور تکذیب اس شکل میں کر رہے ہیں کہ اس کے ساتھ اُن چیزوں کو ملا رہے ہیں جن کے بارے میں اُس نے کہا ہے کہ:-

هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُونَ

اور ہماری پستی و زبوں حالی اور ہماری حیاتِ ارضی میں تمام تر فساد، اللہ کے اس انذار (WARNING) کے مطابق ہے کہ:-

وَمَنْ أَعْرَضَ عَن ذِكْرِي فَإِنَّ لَهُ مَعِيشَةً ضَنكًا وَنَحْشُرُهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ أَعْمَىٰ ۝ (۲۰/۱۲۴)

"جو کوئی بھی ہماری نصیحت (ضابطۂ قانون) سے رُوگردانی اختیار کرے گا تو اُس پر عرصۂ حیات تنگ ہو جائے گا اور قیامت کے روز ہم اُسے اندھا اٹھائیں گے"۔

ہم تمام بہی خواہانِ اسلام اور پاکستان، صاحبانِ بصیرت اور اللہ پر ایمان رکھنے کا دعوٰے کرنے والوں کو دعوت غور و فکر دیتے ہیں کہ وہ اللہ کے اس ارشاد پر ٹھنڈے دل سے، گہرا فکر و تدبر کریں اور سمجھنے کی کوشش کریں کہ اللہ کے یہ کہنے کا مطلب کیا ہے کہ،

هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُونَ

اور اس نے انسانوں سے یہ کیوں کہا ہے کہ ہمارا نازل کردہ ضابطۂ ہدایت ان تمام چیزوں کے مقابلے میں 'خیر' ہے جسے یہ جمع کرتے ہیں۔

اس غور و فکر کے بعد وہ جس نتیجہ پر بھی پہنچیں، اُن کا حال اور مستقبل اسی کے مطابق تشکل پذیر ہوگا۔

یاد رکھئے جو اللہ نے یہ فرمایا ہے کہ:-

هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُونَ

اور ساتھ ہی یہ بھی کہ:

وَمَنْ أَصْدَقُ مِنَ اللَّهِ حَدِيثًا ۝ (۴/۸۷)

اور وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ قِيْلًا ۝ (۴/۱۲۲)

"اللہ کی بات سے زیادہ سچی اور کس کی بات ہو سکتی ہے"۔

تو کیا ہم، اس کے قول کے خلاف، قرآن کے ساتھ دوسری چیزوں کو ملا کر، اس کے ضابطۂ ہدایت ہی کی نہیں، اس کے اپنے قول کی یعنی خود اللہ ہی کی تکذیب نہیں کر رہے۔ سوچئے کہ سوچنے ہی سے انسان اپنی غلط راہوں کو بدل سکتا ہے اور سوچنے ہی سے انسان ایسے نتیجہ پر پہنچ سکتا ہے جس کی ذمہ داری خود اس پر آتی ہے۔

دنیا میں کوئی انسان، کسی دوسرے کے فکر و تدبر کے نتائج کے مطابق چلنے کے لئے مکلف نہیں۔ اسے صرف اسی کا ذمہ دار ٹھہرایا جائے گا جسے اس نے خود سوچ سمجھ کر اختیار کیا ہوگا۔

جزا بھی اُسی کی اور سزا بھی اُسی کی۔

فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ۝ (۹۹/۷)

"پس جو ذرہ برابر بھی عملِ خیر (قانونِ الٰہی کا اتباع) کرے گا اسکے عمل کا خوشگوار نتیجہ اس کے سامنے آجائے گا"۔

وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ۝ (۹۹/۸)

"اور جو ذرہ برابر بھی عملِ شر (قانونِ الٰہی کی خلاف ورزی) کریگا۔ اس کی سزا پائے گا"۔

یہی تھی وہ بنیادی دلیل اور حکمت جسے سمجھانے کے لئے حضور نبی اکرمؐ نے، نبوت پر سرفراز ہونے کے بعد کفارِ مکہ سے اپنے خطاب میں فرمایا تھا کہ میں تم سے لمبی چوڑی بحثوں میں اُلجھنا نہیں چاہتا۔ میں تمہیں **صرف ایک بات** کی نصیحت کرتا ہوں اور وہ یہ کہ دو بھیڑ بکریوں کی طرح آنکھیں بند کر کے نہ چلتے چلے جاؤ بلکہ خالصۃً اللہ کے لئے (سب کے سب نہیں تو) ایک ایک، دو دو کر کے کھڑے ہو جاؤ اور

ثُمَّ تَتَفَكَّرُوْا ۝ (۳۴/۴۶)

"پھر سوچو"۔

کیا اس مملکتِ پاکستان میں کوئی ایک شخص بھی ایسا ہے جو اس دردمندانہ گذارش کو درخورِ اعتنا سمجھے؟ اور

قوم کو یہ بات سمجھا دے کہ قرآن، انسان کی اپنی صنعت کاریوں کی جملہ تخلیقات (احادیث، فقہ، تفاسیر، روایات وغیرھم) سے بہتر اور افضل ہے۔ کیونکہ اس ربّ العالمین نے جو سمیعٌ بھی ہے اور خبیرٌ بھی، جس کے پاس علم کے تمام خزانے ہیں۔ جو سرچشمۂ علم و حکمت ہے، یہ فرمایا ہے کہ

هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ!

تاکہ قوم یک زبان ہو کر اس کا فیصلہ کرے کہ

"مملکتِ پاکستان کا تمام کاروبار قرآنِ کریم کے مطابق طے پائے گا"!

جس دن قوم نے یہ طے کر لیا، اُس دن ہندوستان میں مسلمانوں کی نشأۃ ثانیہ کے نقیب اول سر سید احمد خان، خالقِ تصورِ پاکستان حضرت علامہ محمد اقبال، بانیٔ پاکستان حضرت قائدِ اعظم محمد علی جناح اور مفکرِ قرآن محترم غلام احمد پرویز علیہم الرحمۃ کی عمر بھر کی شب بیداریوں اور جگر کاویوں کا صلہ بھی مل جائے گا اور قوم کو حیاتِ تازہ بھی مل جائے گی۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مکمل اطاعت بھی حاصل ہو جائے گی اور اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ ضابطۂ زندگی اختیار کرنے سے اس کی تمام تر نعمتیں بھی ہماری (اس وقت) خالی جھولی میں آپڑیں گی۔ اُس وقت ہمارا شمار اُن سعادت مند روحوں میں ہو جائے گا جن کے متعلق ربّ العالمین کا ارشاد ہے کہ

.... رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ.... (۹۸/۸)

"اللہ ان سے راضی ہو گیا اور وہ اللہ سے راضی ہو گئے"

کہ یہی ایک مومن کی حیاتِ ارضی کا منتہائے مقصود ہے۔

باب المراسلات

دسواں ترمیمی بل؟

صدر جنرل ضیاء الحق صاحب کا کہنا ہے کہ وہ مملکت کے تمام امور کے فیصلے دستورِ پاکستان کی روشنی میں سرانجام دیتے ہیں۔ روزنامہ جنگ مورخہ ۷ جولائی کی اشاعت میں یہ خبر شائع ہوئی ہے کہ بدھ کی شب پریذیڈنسی راولپنڈی میں سی پی این ای کے اعزاز میں دیئے گئے عشائیہ کے موقع پر خطاب فرماتے ہوئے یہ انکشاف فرمایا ہے کہ ۲۹ مئی کا قدم اٹھانے سے پہلے تین روز تک انہوں نے استخارہ کیا۔ اس امر سے ظاہر ہے کہ صدرِ مملکت اہم مملکتی امور کے فیصلے استخارہ کے ذریعہ سرانجام دیتے ہیں۔ اور استخارہ کے ذریعہ فیصلے کرنا دستور کے عین مطابق ہے۔ کیا صدر مملکت کے اس فیصلے کو دستورِ پاکستان میں ترمیم کا دسواں بل شمار کیا جائے۔؟

محمد سلام، کراچی

۹ جولائی ۱۹۸۸ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مرتبہ: محترم سراج منیر صاحب

روئیداد طلوعِ اسلام سب کنونشن

منعقدہ ۱۰ جون ۱۹۸۸ء بمقام ۲۵ ۔ بی گلبرگ ۲ ۔ لاہور

نمائندگان بزم ہائے طلوعِ اسلام کا سب کنونشن، بروز جمعۃ المبارک، ۱۰ جون ۱۹۸۸ء پرویز میموریل لائبریری، ۲۵ ۔ بی گلبرگ کے ہال میں منعقد ہوا۔

ملک بھر سے بادہ نوشانِ میکدۂ قرآنی، بدھ کے روز سے ہی آنے شروع ہو گئے اور جمعرات کی شام تک دُور سے آنے والے تمام مہمان، لاہور پہنچ چکے تھے

جمعۃ المبارک ۱۰ جون کی صبح، ابھرنے والے سورج کی شعاعیں ابھی شعلہ بار نہیں ہوئی تھیں کہ کنونشن کا پنڈال، شرکاء کی گہما گہمی سے روح افزا نظارہ پیش کر رہا تھا۔ ٹھیک آٹھ بجے محترم پرویز صاحب کے درسِ قرآن کریم کا آغاز بذریعہ ویڈیو ہوا جو حاضرین کے لیے وجہ شادابیٔ سمع و بصر بنا۔

درسِ قرآن کریم کے بعد، محترم محمد عمر دراز صاحب نے شرکاء سے کنونشن کو خوش آمدید کہا اور اپنے استقبالیہ میں، ان وابستگانِ دامنِ قرآن کریم کی، قرآن خالص کی تبلیغی کوششوں کو سراہتے ہوئے انہیں خراجِ تحسین پیش کیا۔ اس کے بعد انہوں نے، اُن کی توجہ ملکِ عزیز کے انتہائی نازک اور اہم حالات کے پیشِ نظر، انکی ذمہ داریوں کیطرف دلائی۔ ملک کے موجودہ حالات جس پرآشوب دور کیطرف بڑھ رہے ہیں اُن کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ اندریں حالات، آنے والے ایام میں اُن کا کردار مثبت اور اُن کی ہر کوشش ملکی سالمیت اور تحفظ کی آئینہ دار ہونی چاہیے کیونکہ جہاں اوروں کے نزدیک یہ مملکت صرف ایک خطۂ زمین ہے، ہمارے نزدیک یہ، اس قرآنی نظام کے قیام کا وسیلہ ہے جس کے لیے اسے حاصل کیا گیا تھا اور جو ہماری دعوت کا گوہرِ مقصود ہے۔ جس جنتِ ارضی کا نقشہ ہمیں قرآن کریم کی رہنمائی دکھاتی ہے، اس کی ابتداء، اس دور میں، اسی خطۂ زمین سے ممکن ہوگی۔

چونکہ یہ استقبالیہ اسی اشاعت میں زینت دہِ اوراق بن رہا ہے اس لیے ہم یہاں اس کی

تفاصیل سے اجتناب کرتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں۔

ناظم ادارہ کی رپورٹ، محترم مرزا محمد خلیل صاحب کی علالت کی بنا پر غیر موجودگی کی وجہ سے، محترم چوہدری محمد لطیف صاحب نے پیش کی جنہیں اسی کنونشن میں نمائندگان بزم ہائے طلوعِ اسلام نے قائم مقام ناظم ادارہ کی حیثیت سے چن لیا۔ اس رپورٹ میں انہوں نے گذشتہ ۶ ماہ کی کارکردگی کا جائزہ لیا اور مستقبل کی راہوں کی نشاندہی کی۔ انہوں نے کہا کہ چونکہ مفکرِ قرآن محترم پرویزؒ صاحب کی وفات کے بعد، ادارۂ طلوعِ اسلام، طلوعِ اسلام ٹرسٹ اور پرویز میموریل لائبریری کے قیام کے ابتدائی مراحل حسن و خوبی سے طے کیے جا چکے ہیں، اس لیے اب، تحریکِ طلوعِ اسلام کی تنظیمِ نو اور ربطِ باہمی کے اہم ترین امور ان کی جملہ کوششوں میں سرِفہرست ہونے چاہئیں۔ اس مقصد کے لیے نمائندگان بزم ہائے طلوعِ اسلام کے سامنے ایک جامع منصوبہ رکھا گیا جسے مکمل اتفاقِ رائے سے منظور کیا گیا۔ اس کی تفاصیل الگ چھٹی کے ذریعہ جملہ بزم ہائے طلوعِ اسلام کو ارسال کی جا رہی ہیں۔

آخر کار کنونشن نے تحریکِ طلوعِ اسلام کے نقیب، ماہنامہ طلوعِ اسلام کی اشاعت اور ضخامت میں اضافہ، آڈیو/ وڈیو درس ہائے قرآنِ کریم کے وسیع تر انتظامات، نئی بزموں کے لیے لائبریریوں کے قیام اور پہلے سے قائم شدہ لائبریریوں میں بہتر مطالعاتی مواد کی فراہمی، پمفلٹ اسکیم اور تبلیغی دوروں کے سلسلوں میں چند اہم اور مفید فیصلے کیے جن کی تفاصیل بھی علیحدہ طور پر بزم ہائے طلوعِ اسلام کو بھیجی جا رہی ہیں۔

ناظم ادارہ کی رپورٹ اور ان اہم امور پر بحث و تمحیص اور فیصلوں کے بعد، آئندہ کنونشن اکتوبر ۱۹۸۸ء میں، منعقد کرنے کے فیصلے کے ساتھ ہی، مزید کاروائی ''نمازِ جمعہ'' کی ادائیگی کے لیے ملتوی کر دی گئی۔

نمازِ جمعہ اور دوپہر کے کھانے کے بعد اجلاس دوبارہ شروع ہوا جس میں طلوعِ اسلام ٹرسٹ کی کارکردگی، احباب کے سامنے پیش کی گئی۔

اس تمام کاروائی کے دوران، احباب کی والہانہ گرم جوشی اور جذبات، اور اپنے مقاصد کے لیے بلند حوصلگی قابلِ دید تھی۔ شام چھ بجے جب کنونشن کے اجلاس اختتام پذیر ہوئے اور احباب کے رخصت ہونے کا وقت آیا تو سب احباب کی آنکھیں ان حسین لمحات کی یاد میں نم آلود ہو گئیں جب مفکرِ قرآن اپنی زندگی میں احباب کو فرداً فرداً رخصت کرتے ہوئے یہ کہا کرتے تھے کہ

وداع و وصل جداگانہ لذّتے دارد
ہزار بار برو، صد ہزار بار بیا

بقیہ صفحہ ۵۱ پر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

استقبالیہ سب کنونشن طلوعِ اسلام۔ لاہور

۱۰ جون ۱۹۸۸ء

جس سے محترم محمد عمر دراز صاحب نے مندوبین سب کنونشن سے خطاب کیا۔

رفیقانِ قافلۂ قرآنی! اسلام در حمت

بادہ مستانِ حرم کے شوق و مستی کی بساط
بچھ رہی ہے پھر سحابِ نور کی آغوش میں

آپ احباب سے، اپریل ۱۹۸۷ء کی کنونشن میں اپنے استقبالیہ کا آغاز میں نے ان الفاظ کیساتھ کیا تھا کہ:۔

آج ہم گیارہ سال کے بعد یہاں اکٹھے ہوئے ہیں تو ہمارے جذبات، غم و مسرت کا ایک عجیب سا کیف لئے ہوئے ہیں۔ غم اس بات کا کہ آج کا یہ اجتماع، پہلی بار اُس مشفق اُستاد اور منفرد مفکرِ قرآن کے بغیر منعقد ہو رہا ہے جو ہمیں ہمیشہ اس نعرۂ مستانہ سے دعوتِ جادہ پیمائی دیتا رہا کہ۔

اک ولولۂ تازہ دیا میں نے دلوں کو
لاہور سے تا خاکِ بخارا و سمرقند
تاثیر ہے یہ میرے نفس کی کہ خزاں میں
مرغانِ سحر خواں میری صحبت میں ہیں خورسند

اور خوشی اس امر کی کہ اُس کے دیئے ہوئے سبق اور اُس کی وساطت سے قرآنِ حکیم تک ہماری رسائی نے ہمیں نہ صرف اُس کی مفارقت کا صدمہ برداشت کرنے کی ہمت دی بلکہ اُس کے زندگی بھر کے پیغام کو آگے بڑھانے، اِسے بحر بیکراں کی وسعتوں سے ہمکنار کرنے اور حیاتِ دوام کی لذتوں سے آشنا کرنے کے لئے، ہم نئے ولولوں، نئی اُمنگوں اور نئے جذبوں کو لے کر اپنی مستقبل کی راہوں کا تعین کرنے اور ان پر حصولِ مقصد کیلئے گامزن ہونے کا بلند اور غیر متزلزل عزم لے کر پھر یکجا وصف آرا ہیں کہ قرآن نے ہمیں یہ سبق دیا ہے کہ۔

وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (۳/۱۳۹)

آج جب میں اپنے دل کی گہرائیوں سے آپ کے لئے عزّت و احترام کے ساغر لئے آپ کو خوش آمدید کہنے کے لئے حاضر ہوا ہوں تو میرے دل میں مفکرِ قرآن علیہ الرحمۃ کی مفارقت کا غم، کم اور اس کے پیغام کو از سرِ نو زندہ اور متحرک کرنے کی مساعی میں اس کنبۂ قرآنی کی اب تک کی کامیابیوں کی خوشی، زیادہ ہے۔ اس مسرت میں یہ عنصر سب سے بڑھ کر ہے کہ ہم سب نے اپنے مشفق اُستادِ مکرّم کی عمر بھر کی کوششوں کے ثمرات کو نہ صرف محفوظ کر لیا ہے بلکہ اُنہیں مزید وسعتیں دینے کے راستے پر گامزن ہیں۔ یہ سب، آپ احباب کی، سرچشمۂ حیاتِ انسانی، قرآن کریم کے ساتھ قابلِ صد تحسین دلبستگی اور ہمہ تن وارفتگی کا کرشمہ ہے۔

آج کی یہ سب کنونشن، اُسی فیصلہ کے مطابق منعقد ہو رہی ہے جو آپ نے سالانہ طلوعِ اسلام کنونشن منعقدہ ۱۶/۱۷ اپریل ۱۹۸۶ء میں کیا تھا۔ آپ حضرات کا اس شدید گرمی کے موسم میں، دُور دراز سفر کی صعوبتیں برداشت کر کے یہاں تشریف لانا، آپ کے جذبات اور ولولوں کی صداقت اور قرآنِ کریم کے عطا کردہ نظامِ حیات کے نفاذ کو عملاً ممکن بنانے کی تڑپ اور شدّتِ آرزو کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ اور ایسا کیوں نہ ہو جب کہ آپ نے اس کتابِ عظیم کا دامن تھام رکھا ہے جس کے متعلق اس کے نازل کرنے والے کا ارشاد ہے۔

اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِيْ لِلَّتِيْ هِيَ اَقْوَمُ .... (۱۷/۹)

(بلاشبہ یہ قرآن (سفرِ زندگی میں) اس راستہ کی طرف رہنمائی کرتا ہے جو سب سے سیدھا اور متوازن ترین ہے۔

ہمیں اس کا کامل یقین ہے کہ جو بھی سیدھی اور متوازن راہ پر چلے گا اُس کا ہر قدم اُسے آگے کی طرف اور منزل کے قریب لاتا جائے گا۔

برادرانِ گرامی! اس حقیقت میں ذرّہ برابر بھی شبہ نہیں کہ آپ نے ہمیشہ حالات کے تقاضوں کے مطابق قرآنی تعلیم کو عام کرنے اور اس مملکت میں نفاذِ نظامِ قرآنی کو ممکن بنانے کے لئے، قابلِ صد رشک انداز میں آگے بڑھ کر اپنی تمام تر امکانی وسعتوں کے ساتھ لبیک کہتے ہوئے، مفکرِ قرآن علیہ الرحمۃ کی پیش کردہ قرآنی فکر کو ملک میں عام کرنے کے لئے بھرپور کوششیں کی ہیں۔ اور اسی کا نتیجہ ہے کہ مختلف کونوں سے قرآنی تعلیمات کو پیش کرنے والوں کے بیشتر الفاظ اور ترکیبات آپ کے ہاں سے مستعار لئے جاتے ہیں۔

لیکن آج ملک جس دوراہے پر آ کھڑا ہوا ہے اس نے پھر سے ہمارے سامنے ایک نیا چیلنج پیش کر دیا ہے۔ اس وقت پھر سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے الاسلام اور آپؐ اور آپکے

رفقائے کار والذین معہ رضوان اللہ علیہم جمیعاً کے ہاتھوں قائم کردہ، انسانیت ساز قرآنی نظامِ حیات کے نفاذ کے قیام کے امکانات از سرِنو پیدا ہو گئے ہیں لیکن ساتھ ہی ہمارے دورِ ملوکیت کے ایجاد کردہ اسلام کے علمبرداران کے لئے بھی میدان کھل گیا ہے۔ ملک میں پھر سے انتخابات کی آمد آمد ہے اور سیاسی اور مذہبی جماعتیں صف آرا ہونے میں مصروف ہو جائیں گی کہ اپنے اپنے مقاصد کو بروئے کار لائیں۔ آنے والے دنوں میں ہر کوئی ہر وہ حربہ استعمال کرے گا جس سے اس کی مقصد براری ہوتی ہو۔ لیکن آپ، کہ جنہوں نے اپنا مقصدِ زندگی اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد بنا رکھا ہے کہ اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ ...... (۷/۳) "صرف اسی کا اتباع کرو جو کچھ تمہارے ربّ کی طرف سے نازل کیا گیا ہے اور اس کے علاوہ کسی کارساز و رفیق کا اتباع مت کرو۔" دوہری ذمہ داریوں کے حامل ہو جاتے ہیں۔

ان میں پہلی ذمہ داری اپنی تبلیغی مساعی کو تیز تر کرنے کی ہے تاکہ خالص قرآنی پیغام ہر فردِ مملکت تک پہنچ جائے اور وہ انتہائے آرزو سے اس مملکت میں قرآنی نفاذ کے لئے کوششوں میں ہمہ تن مصروف ہو جائے اور دوسری یہ کہ آپ یہ کچھ اس انداز میں کریں کہ آپ کا کوئی اقدام تحفظ و استحکامِ پاکستان کے خلاف نہ جائے۔ آپ کا شعار یہ ہونا چاہیئے کہ :-

نہ از ساقی، نہ از پیمانہ گفتم
حدیثِ عشق بے باکانہ گفتم

آپ حضرات سے بڑھ کر کون اس حقیقت کو جانتا ہے کہ اس مملکت کے حصول کا مقصد (قائد اعظم علیہ الرحمۃ کے الفاظ میں) قرآنی احکام و اصول کی حکمرانی قائم کرنا تھا۔ اس لئے آپ کی تمام تر کوششیں اسی عظیم مقصد کو بروئے کار لانے کے لئے ہیں کہ اس مملکت میں خدائے واحد کا تختِ اجلال بچھایا جائے۔ اس وقت ہمارے سامنے یہ موقع نئے سرے سے اُبھر کر آگیا ہے کہ ہم اپنے تمام تر وسائل کے ساتھ قرآن کریم کے پیغام کو پھیلانے میں دل کی پوری صداقتوں کے ساتھ مصروفِ عمل ہو جائیں تاکہ اللہ تعالیٰ سے کیا ہوا ہمارا یہ وعدہ پورا ہو سکے کہ ہم اس مملکت میں اس کا عطا کردہ نظامِ زندگی نافذ کریں گے۔

آپ احباب نے، یقیناً مجلّہ طلوعِ اسلام بابت جون ۱۹۸۸ء کے شمارہ کے لمعات پڑھ لئے ہوں گے۔ جن میں وضاحت سے کہا گیا ہے کہ پاکستان کے حصول کی کوششیں جن حسین آرزؤں اور وعدوں کے ساتھ کی گئیں تھیں، اس کے حصول کے بعد اُن کا ایفا ہمارے لئے کس قدر اہم ہے۔ اور اگر ہم نے ان وعدوں کو پورا نہ کیا تو ہمیں اس قادرِ مطلق کی یہ وارننگ یاد رکھنی چاہیے کہ وَاِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ

ثُمَّ لَا يَكُونُوٓا اَمۡثَالَكُمۡ (۴۷/۳۸) "اگر تم نے روگردانی اختیار کی تو وہ تمہاری جگہ دوسری قوم لے آئے گا اور پھر وہ تمہارے جیسے (عہد فراموش اور احساس ناشناس) نہیں ہوں گے۔" لہٰذا مملکتِ پاکستان کی نظریاتی اور جغرافیائی سرحدوں کی حفاظت کرتے ہوئے ہمارا عزم یہ ہونا چاہیئے کہ

ے خانہ سلامت ہے تو ہم سُرخیٔ مے سے
تزئینِ در و بامِ حرم کر کے رہیں گے

اب میں اپنا روئے سخن، محترم صدرِ مملکت جنرل محمد ضیاء الحق صاحب کی طرف کرنا چاہتا ہوں اور ان کی خدمت میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ آپ نے قومی اسمبلی کو کالعدم قرار دیتے ہوئے، قوم سے اپنی نشری تقریر میں فرمایا ہے کہ:-

"اسلام کے ساتھ میری لگن اور نفاذِ اسلام کے لئے میری تڑپ کسی وضاحت کی محتاج نہیں۔ دعا کیجئے اللہ تعالیٰ مجھے اس میں کامیابی عطا فرمائے۔"

اور یہ کہ آپ کی ترجیحات میں، سرِفہرست، اسلامی نفاذ کے عمل کو تازہ کر کے اسے مکمل کرنے کے اقدامات کرنا ہیں۔ حسنِ اتفاق سے ماہنامہ طلوعِ اسلام بابت جون ۱۹۸۸ء کے لمعات اسی موضوع کے لئے مختص ہیں۔ ہم یہ لمعات آپ کی خدمت میں پیش کرتے ہوئے یہ عرض کر دینا چاہتے ہیں کہ (جیسا کہ ان لمعات میں کہا گیا ہے) تحریکِ حصولِ پاکستان کی کوششیں ان حسین آرزوں اور اپنے ربّ کے ساتھ ان وعدوں کے ساتھ شروع کی گئیں تھیں کہ اگر خدائے رحیم و کریم کے فضل و عنایت سے ہمیں یہ مملکت حاصل ہو جائے تو ہم اس میں اس کے عطا کردہ آخری، مکمل، غیر متبدل اور محفوظ ضابطۂ حیات "القرآن العظیم" کو بطور ضابطۂ مملکت نافذ کر دیں گے اور یہ کہ اس مملکت کا مقصد صرف اور صرف (قائدِ اعظم علیہ الرحمۃ ہی کے الفاظ میں) قرآنی احکام و اصول کی حکمرانی قائم کرنے میں ہے۔ اگر اس کے خلاف، خود ساختہ اور دورِ ملوکیت کا ایجاد کردہ ہمارا مروّجہ اسلام نافذ کرنے کی کوششیں ہوئیں تو یہ ہمارے ان وعدوں سے انحراف ہوگا۔

اس وقت آپ کو پھر سے اس مملکت میں کامل اختیار حاصل ہو گیا ہے اور آپ اس میں اسلامی نظام کے نفاذ کے صدقِ دل سے آرزومند بھی ہیں تو پھر کون امر مانع ہو سکتا ہے کہ آپ اسمیں قرآنِ کریم کا نظام نافذ کر دیں۔ اس وقت آپ کی صورت یہ ہے کہ

جس نوں یار وکیندا لبھّے تے قیمت ہووس پلّے
اس دے جیڈ نہ طالع ڈٹھا اُس دے بھاگ سوَلّے

اگر آپ نے ایسا کر دیا تو ملّتِ پاکستانیہ آپ کے قدم چومے گی، عالمِ اسلام میں آپ کو قیادتِ عظمیٰ حاصل ہو جائے گی۔ اقوامِ عالم آپ کی طرف رشک کی نگاہوں سے دیکھیں گی اور جریدۂ عالم پر آپ کا نام سورج کی کرنوں سے لکھا جائے گا۔ سعادت آپ کے دروازے پر دستک دے رہی ہے۔ اُٹھئے اور اسے لبیک کہئے۔

کرسئ اقتدار کے متعلق عربی زبان کا یہ مشہور مقولہ ایک زریں، دائمی اور اٹل اصول کی طرف توجہ دلاتا ہے کہ

لودامت لغیرك ماتصلت بك

یعنی اگر دوسرے اسے (کرسئ اقتدار کو) اپنے پاس ہمیشہ ہمیشہ کے لئے رکھ سکتے تو یہ آپ تک ہرگز ہرگز نہ پہنچتی۔ اقتدار ہمیشہ کسی کے پاس نہیں رہا کیونکہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے کہ:-

تِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ ......(۳/۱۴۰)

لیکن وہ سعادت مند اشخاص زندہ جاوید ہو جاتے ہیں جو اپنے دورِ اقتدار میں اللہ کے عطا کردہ قانون (قرآنی نظام) کو سرفراز اور سربلند کر جائیں۔ ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو اس سعادت سے بہرہ ور فرمائے۔

ادارہ طلوعِ اسلام کہ جس کا قیام ۱۹۳۸ء میں عمل میں لایا گیا تھا اور جس کا مقصد یہ تھا کہ:-

اوّلاً۔ مسلمانانِ ہند کے لئے ایک الگ آزاد مملکت کے حصول کے لئے راہ ہموار کی جائے اور قرآن کریم کی روشنی میں دو قومی نظریہ کے مطابق ایسی آزاد مملکت کے نمایاں خدوخال قوم کے سامنے پیش کرتے ہوئے، اسے ایک قومی مطالبہ کی شکل دی جا سکے اور

ثانیاً۔ اس مملکت کے حصول کے بعد اس میں اللہ تعالیٰ کے عطا فرمودہ قرآنی احکام و اقدار و قوانین کو ان کی خالص اور منزہ شکل میں قوم کے سامنے یوں بالاستمرار پیش کیا جائے کہ اس ضابطۂ زندگی (القرآن العظیم) کا نفاذ مملکت کے نظام کی حیثیت سے ممکن ہو جائے۔

اپنے قیام سے آج تک یہ فریضہ اپنی امکانی حدود تک سرانجام دے رہا ہے۔ چنانچہ اس کی طرف سے اس ضمن میں اس قدر گراں بہا قرآنی لٹریچر شائع کیا جا چکا ہے کہ وہ یقیناً آپ کے لئے مشعلِ راہ کا کام دے سکتا ہے۔

محترم صدرِ مملکت کی خدمت میں اس ضروری عرض داشت کے بعد میں پھر آپ کی طرف متوجہ ہوتا ہوں۔

آپ سب اس حقیقت سے بخوبی واقف ہیں کہ تحریک کو بہتر سے بہتر طور پر چلانے کے لئے مرکز اور بزم ہائے طلوعِ اسلام میں مثالی رابطہ کی اشد ضرورت ہے۔ آپ کے مرکز نے رابطۂ باہمی کو مضبوط بنیادوں پر استوار

کرنے اور تبلیغی کوششوں کو تیز تر کرنے کے لئے ایک خاکہ تیار کیا ہے۔ جسے برادر محترم سراج منیر صاحب آپ کی خدمت میں پیش کریں گے جس کے بعد اسی نشست میں اس پر غور و خوض اور بحث و تمحیص کے بعد اسے آخری شکل دینا آپ کے پیش نظر ہوگا۔

بارِ دگر آپ کی خدمت میں یہ عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ آئندہ انتخابات کے دوران آپ کا طریق کار نہایت محتاط ہونا چاہیئے۔ جہاں آپ اس دوران شدّ و مد سے قرآنی پیغام کو عام کرنے میں مصروفِ عمل ہوں گے وہیں یہ بھی انتہائی ضروری ہے کہ آپ سے کوئی حرکت ایسی سرزد نہ ہونے پائے جس سے اس خطۂ زمین کے استحکام میں ضعف آنے کا امکان ہو۔ اس لئے کہ ہماری درخشندہ اُمیدیں اور تابناک آرزوئیں اسی خطۂ زمین سے وابستہ ہیں۔ ہم جس جنتی معاشرہ کا قرآنی تصوّر عام کر رہے ہیں اس کی عملی تشکیل اسی خطہ میں ہو سکے گی۔ عام لوگوں کے لئے یہ خطۂ زمین محض ایک مملکت ہے لیکن ہمارے لئے یہ قرآنی زندگی بسر کرنے کا لاینفک ذریعہ اور نوعِ انسان کو موجودہ جہنم سے نکالنے کا دروازہ ہے۔ اس لئے ہمارے نزدیک اسکی سالمیت کی اہمیت واضح ہے۔ ملک کے اندر ایسے عناصر موجود ہیں جو تحریک پاکستان کے سخت دشمن تھے اور جواب مقدس نقابوں کی اوٹ میں ملک میں تخریب و انتشار پیدا کرکے اپنی شکستِ پندار کا بدلہ لینا چاہتے ہیں۔ طلوعِ اسلام کے خلاف ہنگامہ آرائی میں دیکھئے کتنا بڑا عنصر اُن گروہوں کا ہے جن سے یہ تحریکِ پاکستان کے دوران نبرد آزما تھا کیونکہ وہ اس تصوّر کی مخالفت کرتے اور اسے دین کے خلاف بتاتے تھے۔ ان کے سینوں میں وہی پرانے زخم ہیں جو اب تک مندمل نہیں ہو سکے۔ یہ لوگ آپ کو ہر طرح کا اشتعال دلائیں گے اور آپ کے خلاف ہر قسم کے کذب و افترا پردازی کے حربے آزمائیں گے لیکن آپ نے ضبط کے دامن کو ہرگز ہرگز نہیں چھوڑنا۔

آپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ ہماری دعوت فرقہ بندی اور پارٹی بازی کے خلاف مسلسل جہاد ہے کیونکہ اُمّت میں تفرقہ خواہ وہ مذہب کے نام پر ہو یا سیاست کے، دین کی یکسر نقیض ہے دین وحدتِ انسانیت کا علمبردار ہے جس کی منزلِ اوّل وحدتِ اُمّت ہے۔ اس لئے آپ کا کوئی قول عمل یا فعل ایسا نہیں ہونا چاہیئے جس میں فرقہ بندی اور گروہ سازی کا شائبہ تک بھی پایا جائے۔ چونکہ عملی سیاست میں حصہ لینا ہمارے پروگرام میں شامل نہیں اس لئے ہمیں سیاسی ہنگامہ آرائیوں سے بھی کوئی واسطہ نہیں۔ ہمارے سامنے تو بس ایک ہی پروگرام ہے اور وہ یہ کہ قرآنِ کریم کی تعلیم کو صحیح طور پر خود سمجھیں اور اسے دوسروں تک بھی پہنچائیں اور اس کے مطابق اپنے اندر اور دیگر افرادِ اُمّت کے اندر ایسی نفسیاتی تبدیلی پیدا کرتے جائیں جس سے ہمارا معاشرہ قرآنی خطوط پر متشکل ہو سکے۔

ہماری تحریک جو کچھ پیش کرتی ہے اگر وہ قرآنِ کریم کے مطابق ہے (اور بفضلِ تعالیٰ یہ ایسا ہی ہے) تو ہزار مخالفتوں کے باوجود زندہ رہے گا اور آگے بڑھے گا اس لئے کہ کائنات میں محو و ثبات اللہ کے قانون کے مطابق واقع ہوتا ہے۔

يَمْحُوا اللّٰهُ مَا يَشَاءُ وَيُثْبِتُ ۚ وَعِنْدَهٗٓ اُمُّ الْكِتٰبِ (۱۳/۳۹)

لہذا چونکہ ہماری بات قرآن کے مطابق ہے اس لئے ہو نہیں سکتا کہ زمانہ اسے قبول نہ کرے اگر یہ حق پر مبنی ہے تو ہمیں یقین ہے کہ:

روشِ دہر کا ہر نقش پکارے گا مجھے یہ نہ سمجھو کہ مجھی تک میرا افسانہ ہے۔

یاد رکھیئے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں (حضور نبیٔ اکرمؐ کو مخاطب کر کے) یہ حوصلہ بخش تعلیم دی ہے کہ تمہارا کام اپنے فریضہ کی ادائیگی ہے۔ یہ دیکھنا تمہارا کام نہیں کہ اس کے نتائج کب مرتب ہوتے ہیں یہ ہمارے قانونِ مکافات کے مطابق ہوگا۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے۔

.... فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ وَعَلَيْنَا الْحِسَابُ ○ (۱۳/۴۰)

اس لئے ہمیں نتائج کے متعلق پر اُمید ہو کر اپنی دُھن میں آگے بڑھتے چلے جانا ہے۔ اگر ہمارا پروگرام قانونِ الٰہی کے مطابق ہے، ہمارے ارادے نیک اور ہمت میں استقامت ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ زود یا بدیر اس کے خوشگوار نتائج مرتب نہ ہوں۔ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ (۹/۱۲۰) اس اللہ کا ارشاد ہے جس کا ہر وعدہ سچا ہوتا ہے۔

آخر میں ایک بار پھر آپ احباب کی خدمت میں اس سادہ و حسین اور بلند مقاصد رکھنے والے اجتماع میں شرکت کے لئے ہدیۂ سپاس گذاری پیش کرتے ہوئے دعا گو ہوں کہ اللہ آپ کے ارادوں میں برکت، دلوں میں اخلاص، بازوؤں میں ہمت اور پاؤں میں استقامت عطا فرمائے اور زندگی کے جس درخشندہ و تابناک مقصدِ جمیل و جلیل کو لے کر آپ اُٹھے ہیں، خدا کی کائناتی قوتوں کی تائید آپ کے شاملِ حال ہو اور آپ تمام موانع پر قابو پاتے ہوئے اس راہ میں آگے بڑھتے چلے جائیں۔

آپ یہاں تشریف لائے ہیں تو اس ولولہ کو لے کر کہ:

ضمیرِ لالہ میں روشن چراغِ آرزو کر دیں چمن کے ذرّے ذرّے کو شہیدِ جستجو کر دیں

اور جب یہاں سے جائیں تو اس عزمِ بلند کو ساتھ لے کر کہ محترم پرویز صاحب کی فکرِ قرآنی سے استفادہ کرتے ہوئے اس شمعِ نورانی کی ضیا باریاں اس جہانِ رنگ و بو میں ہر طرف پھیلا دیں گے۔

رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّثَبِّتْ اَقْدَامَنَا .... ○ (۲/۲۵۰)

.... رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ۭ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ○ (۲/۱۲۷)

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اسلام اور جدید تصورِ قانون

قرآن کو بازیچۂ تاویل بنا کر
چاہے تو خود اک تازہ شریعت کرے ایجاد
(علامہ اقبالؒ ضربِ کلیم)

پروفیسر ڈاکٹر محمد طاہر القادری صاحب کے چونکا دینے والے ارشادات جن کا اظہار انہوں نے "انٹرنیشنل مسلم لائرز فورم" کے زیرِ اہتمام "خطباتِ لاہور" کے سلسلے میں "اسلام اور جدید تصورِ قانون" کے موضوع پر خصوصی خطبات میں کیا تھا، ۱۳ اپریل ۱۹۸۸ء کی اشاعت میں نظر سے گزرے۔ انہوں نے فرمایا: "اسلام کے تصورِ قانون میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولؐ اقتدارِ اعلیٰ کے مالک ہیں اور رسول اکرمؐ کی حاکمیت تسلیم کئے بغیر خالقِ کائنات کی حاکمیتِ اعلیٰ کا تصور مکمل نہیں ہو سکتا۔" انہوں نے کہا کہ پاکستان کے آئین میں یہ سقم موجود ہے جس میں اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کے بعد حضرت نبی اکرمؐ کی حاکمیت کو درج کئے بغیر حکمرانوں کو اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کا امین قرار دیا گیا ہے۔ اسلام کے تصورِ حاکمیت میں حضرت نبی اکرمؐ، اللہ تعالیٰ کے نائب ہیں اور قیامت تک پوری اُمتِ مسلمہ، حضرت نبی اکرمؐ کی نائب ہے گی..... اسلام کی رُو سے واضعِ قانون کی حیثیت صرف اللہ تعالیٰ اور اُس کے رسولؐ کو حاصل ہے۔ اللہ تعالیٰ کی حاکمیت حقیقی اور اصلی ہے جبکہ رسول اللہؐ کی حاکمیت نیابتی اور تفویضی ہے۔ علامہ صاحب نے متعدد قرآنی آیات سے رسول اللہؐ کی حاکمیت کے بارے میں تفصیل سے روشنی ڈالی۔"

اللہ اپنی حکومت میں کسی کو شریک نہیں کرتا (۱۸/۲۶)

جب ایک مفسرِ قرآن، جیسے پروفیسر طاہر القادری صاحب جانے پہچانے جاتے ہیں، ایک غیر قرآنی بات کہہ دیں تو وہ چونکا دینے والی خبر ہی ہو گی۔ پروفیسر صاحب کے پاس یہ کہنے کی کیا قرآنی سند ہے کہ "رسول اکرمؐ کی حاکمیت تسلیم کئے بغیر خالقِ کائنات کی حاکمیت کا تصور مکمل نہیں ہوتا۔" انہوں نے تو ویسی ہی بات کہہ دی جیسے کچھ عرصہ پہلے ایک اور عالمِ دین، جناب مفتی محمد حسین نعیمی صاحب، نے ریڈیو پاکستان کے صبح کے دینی پروگرام میں کہی تھی کہ "اللہ کی اطاعت" اور "رسول کی اطاعت" دو

علیحدہ علیحدہ اطاعتیں ہیں! اپنی بات کو وزن دار بنانے کے لئے مفتی صاحب نے کہا کہ ایسی مثالیں موجود ہیں جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ قرآن نے ایک بات کہی اور رسول اللہ نے اُس کے بالکل مختلف بات کہی (نعوذ باللہ)۔ جب ریڈیو پاکستان لاہور، کی وساطت سے اُن کی خدمت میں عرض کیا گیا کہ رسولؐ کی اطاعت سے دراصل اللہ کی اطاعت مراد ہے (۴/۸۰)۔ رسول اللہ اپنے کسی حکم کی اطاعت کسی سے نہیں کراتے تھے کیونکہ یہ بات رسولؐ کے شایانِ شان نہیں تھی کہ وہ انسانوں کو قوانینِ خداوندی کی بجائے اپنے احکام کا محکوم بنائے (۳/۷۸-۷۹)۔ رسول اللہ تو وہی احکام پہنچاتے تھے (اُمت کو) جو اُن پر وحی کئے جاتے تھے اس لئے رسول اللہ کا کوئی قول، فعل یا عمل قرآن حکیم کے احکام کے خلاف جا ہی نہیں سکتا (۵/۴۸-۴۹)۔ تو مفتی صاحب نے چپ سادھ لی۔ دراصل مفتی صاحب کہنا یہ چاہتے تھے کہ "اللہ کی اطاعت" کا مفہوم تو قرآن حکیم سے مل جائے گا "رسول کی اطاعت" سے کیا مُراد ہے یہ ہم (علماء) بتائیں گے (غالباً روایات کی روشنی میں)!

اب یہ جو بحث جناب پروفیسر طاہر القادری صاحب نے چھیڑی ہے تو اس سے بھی اُن کا مقصد یہ بتانا نظر آتا ہے کہ "اللہ کی حاکمیت" اور "رسول کی حاکمیت" دو علیحدہ علیحدہ حاکمیتیں ہیں! اور "رسول اکرمؐ کی حاکمیت تسلیم کئے بغیر خالقِ کائنات کی حاکمیتِ اعلیٰ کا تصور مکمل نہیں ہو سکتا"۔ پروفیسر صاحب یہ کیوں بھول گئے ہیں کہ قرآن حکیم نے تو دو ٹوک الفاظ میں، آج سے ۱۴۰۰ سال پہلے، خود رسول اللہ کی زبانِ مبارک سے کہلوایا تھا۔ وَلَا يُشْرِكُ فِي حُكْمِهِ أَحَدًا (۱۸/۲۶) "یاد رکھو! اللہ اپنی حکومت، اپنے اقتدارِ اعلیٰ میں کسی اور کو شریک نہیں کرتا۔ (چاہے وہ نبی ہی کیوں نہ ہو (۳/۷۸)" اور نہ ہی اللہ اپنے اختیارات کسی کو تفویض کیا کرتا ہے۔ سورہ یوسف میں ہے۔ إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلَّهِ "حکومت کا حق صرف اللہ کو حاصل ہے" أَمَرَ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا إِيَّاهُ "اُس نے حکم دیا ہے کہ اُس کے سوا کسی کی اطاعت اور محکومیت نہ کی جائے" ذَٰلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ (۱۲/۴۰) "یہی نظامِ مملکت سب سے محکم ہے۔ یہ ہے زندگی کا محکم اور استوار نقشہ۔ (لیکن اکثر لوگ اس حقیقت کو نہیں جانتے)"۔ قرآنِ حکیم کے اس واضح اعلان کے باوجود پروفیسر صاحب نے "رسول اللہ کی حاکمیت" والی بات کیسے کہہ دی؟ ایسا لگتا ہے کہ جیسے پروفیسر صاحب قرآنِ حکیم کو، اپنے پہلے سے قائم شدہ خیالات، نظریات، معتقدات اور تصورات کے مطابق بنانے کی کوشش کر رہے ہیں! ہونا تو یہ چاہئے کہ ہمیں اپنے نظریات اور خیالات کو قرآن حکیم کے مطابق بنانا چاہئے نہ کہ قرآن کو اپنے نظریات اور خیالات کے مطابق۔ اور یہ تبھی ممکن ہوگا جب ہم خالی الذہن ہو کر (یعنی ذہن کو پہلے سے قائم شدہ نظریات اور خیالات سے پاک کر کے) قرآنِ حکیم کی طرف جائیں اور جو کچھ وہاں سے ملے اُسے بغیر کسی خارجی ملاوٹ کے قبول

کریں، اس پر غور و فکر کریں، اور عمل کریں۔ لیکن چونکہ (اخباری رپورٹوں کے مطابق) پروفیسر طاہر القادری صاحب کا یہ دعویٰ ہے کہ خود صاحبِ قرآن اُن کے پاس آئے تھے اور پھر آنے کا وعدہ کر گئے ہیں، اس لئے ایسا لگتا ہے کہ جیسے اُن کو قرآن کو "بازیچۂ تاویل" بنانے کا اختیار مل گیا ہو۔ غالباً اسی قسم کی صورتِ حال سے متأثر ہو کر علامہ اقبالؒ نے فرمایا تھا:

قرآن کو بازیچۂ تاویل بنا کر
چاہے تو خود اک تازہ شریعت کرے ایجاد! (ضربِ کلیم)

ایک اور جگہ فرمایا ہے:

"احکام ترے حق ہیں، مگر اپنے مفسّر
تاویل سے قرآں کو بنا سکتے ہیں پاژند!" (بالِ جبریل)

آیئے جو مسئلہ پروفیسر صاحب نے اُٹھایا ہے اُسے "احکامِ حق" کی روشنی میں دیکھیں۔

حقِ حکومت

حکومت (مادہ ح۔ک۔م) کے بنیادی معنی ہیں کسی کو ایک مقام پر روک دینا۔ یعنی اُسے بتا دینا کہ تم اِس حد سے آگے نہیں بڑھ سکتے۔ اس کو "حُکْمٌ" کہتے ہیں۔ یعنی فیصلہ۔ حاکم کے معنی فیصلہ کرنے والا ہیں۔ یعنی ہر ایک کے حقوق و واجبات کی حدیں مقرر کرنے والا اور اختلافی معاملات میں بتانے والا کہ کس کی حد کہاں تک ہے۔ دورِ حاضر کی اصطلاح میں اس "حد بندی" کا نام قانون سازی ہے۔ اور قانون کی کارفرمائی۔

جیسے کہ ہم جانتے ہیں حکومت کے دو شعبے ہوتے ہیں۔ ایک قانون سازی کا۔ اور دوسرے قوانین کو نافذ کرنے کا۔ قرآن حکیم کی رُو سے انسانوں کے لئے اصلاً و اساساً قانون سازی کا اختیار کسی انسان کو حاصل نہیں۔ یہ حق صرف اللہ کو حاصل ہے۔ (۶/۵۷، ۶/۶۲، ۱۲/۴۰، ۱۲/۶۷، ۱۸/۲۶، ۲۸/۷۰، ۴۰/۱۲)۔ اللہ تعالیٰ نے جو دین عطا فرمایا ہے اُس کی بنیاد احترامِ انسانیت اور شرفِ آدمیت پر ہے۔ اُس نے کہا ہے کہ ہر انسان، انسان ہونے کی جہت سے یکساں واجب التکریم ہے۔ (۱۷/۷۰) اس لئے یہ چیز شرفِ انسانیت کے منافی ہے کہ کوئی انسان کسی دوسرے انسان کا محکوم ہو۔ قرآن نے یہ انقلاب آفرین اعلان کیا کہ:

انقلاب آفرین اعلان

مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ

كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ..... (۳/۷۹)

"کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں۔ خواہ اُسے ضابطۂ قوانین، اختیارِ حکمرانی، حتیٰ کہ نبوت بھی کیوں نہ حاصل ہو کہ وہ دوسرے انسانوں سے کہے کہ تم اللہ کے نہیں بلکہ میرے محکوم بن جاؤ"

اس آیت میں کہا یہ گیا ہے کہ حقِ حکومت صرف خدا کو حاصل ہے۔ کسی انسان کو نہیں، خواہ وہ شخصی حکومت کی شکل میں ہو اور خواہ قانون سازی کے اداروں کی صورت میں۔ حتیٰ کہ نبی تک کو بھی اس کا حق حاصل نہیں۔ شرفِ انسانیت کا تحفظ اسی صورت میں ممکن ہے کہ حکم دینے یا قانون صادر کرنے کا حق انسانوں سے بلند کسی ہستی کو ہو۔ اس ہستی کو اللہ کہا جاتا ہے۔ جو لوگ اس حقیقت کو تسلیم کر لیں انہیں مومن ــــ یعنی خدا پر ایمان لانے والے کہہ کر پکارا جائے گا۔ بالفاظِ دیگر ایمان باللہ کا بنیادی مفہوم یہ ہے کہ حقِ حکومت کسی انسان کو حاصل نہیں، صرف اللہ کو حاصل ہے۔ "لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ" سے یہی مُراد ہے۔

قرآنِ حکیم کی حاکمیّت

اس ایمان باللہ کے بعد لازماً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نہ ہمیں کہیں دکھائی دیتا ہے نہ وہ ہمارے سامنے آتا ہے۔ نہ ہم اپنے کانوں سے اُس کی بات سُن سکتے ہیں۔ تو اس کے احکام کی اطاعت کس طرح کی جائے؟ اس کا جواب اللہ نے اسی آیت میں دے دیا جس کا آدھا حصہ اوپر دیا گیا ہے۔ اس کا باقی حصہ یوں ہے۔

وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ (۳/۷۹) "تمہیں کسی انسان کی محکومیت اختیار نہیں کرنی چاہیئے۔ محکومیت صرف خدا کی اختیار کرنی چاہیے اور اس کا ذریعہ وہ کتاب ہے جسے اس نے نازل کیا جسے تم پڑھتے پڑھاتے ہو اور جس کے احکام و مطالب تم اپنے دل و دماغ میں جاگزیں کرتے ہو"

آپ غور کیجئے کہ قرآنِ حکیم نے کیسے بلیغ انداز سے اس بات کو سمجھا دیا کہ خدا کی محکومیت اختیار کرنے کا قابلِ عمل طریقہ کیا ہے۔

اہم نکتہ

آپ غور کیجئے کہ آج اس دور میں، جسے انتہائی تہذیب و تمدن کا زمانہ کہا جاتا ہے، مبنی بر عدل حکومت کا تصور یہ ہے کہ وہ سب سے پہلے ایک آئین مرتب کرتی ہے۔ اس آئین کو کتاب کی شکل میں شائع

کیا جاتا ہے۔ پھر اس آئین کے مطابق قوانین وضع کئے جاتے ہیں اور وہ قوانین بھی کتابوں کی شکل میں عام کئے جاتے ہیں۔ اس کے بعد ہر متنازعہ فیہ معاملہ کے تصفیہ کے لئے ان کتابوں کا حوالہ دیا جاتا ہے۔ بالفاظِ دیگر حکمرانی کتاب کی ہوتی ہے۔ کتاب کی حکمرانی میں کوئی یہ نہیں پوچھتا کہ وہ لوگ کہاں ہیں جنہوں نے اس کتاب کو مرتب کیا تھا۔ وہ ہمارے سامنے کیوں نہیں آتے۔ ہم ان کی کوئی بات نہیں مانیں گے، جب تک وہ ہمیں خود حکم نہ دیں۔ کوئی اس کا تقاضا نہیں کرتا۔ غور کیجئے کہ قرآن حکیم نے یہ بات چودہ سو سال پہلے کہی تھی کہ حکمرانی کتاب (ضابطہ قوانین) کی ہوتی ہے۔ اور اس کی موجودگی میں اس کی ضرورت نہیں رہتی کہ صاحبِ کتاب خود ہمارے سامنے آکر حکم دے تو پھر اس کی اطاعت کی جائے۔ کتاب کی اطاعت درحقیقت کتاب دینے والے کی اطاعت ہوتی ہے۔ لہٰذا، اللہ کی اطاعت کی عملی شکل اُس کی کتاب کی اطاعت ہے۔ اور اللہ پر ایمان کا عملی مفہوم اُس کی کتاب پر ایمان لانا ہے۔ جو شخص اللہ کی کتاب القرآن۔ پر ایمان نہیں لاتا، اس کا اللہ پر ایمان لانا بھی قابلِ تسلیم نہیں ہو سکتا۔ اور جو شخص اس کی کتاب کی محکومیت اختیار نہیں کرتا وہ اللہ کی حاکمیت سے انکار کرتا ہے۔ یہ وجہ ہے کہ اس نے واضح الفاظ میں کہہ دیا ہے کہ: وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ (۵/۴۴) "جو لوگ اللہ کی کتاب کی محکومیت اختیار نہیں کرتے۔ وہی تو کافر کہلاتے ہیں"

جس کتاب کی محکومیت اختیار کی جانی مقصود ہو، یہ نہایت ضروری ہے کہ وہ اپنی ہر بات کو واضح طور پر بیان کرے۔ اس میں کوئی ابہام نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب کی اس خصوصیت کو مختلف مقامات پر واضح کر دیا۔ مثلاً سورہ النحل میں ہے: وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ... (۱۶/۸۹) "اے رسولؐ! ہم نے تم پر ایک ایسی کتاب نازل کی ہے جو اپنی ہر بات کو نہایت وضاحت سے بیان کر دیتی ہے"

آخری کتاب

اللہ کی اس محکومیت کا سلسلہ تو شروع سے جاری تھا لیکن چونکہ اُن (ابتدائی) ادوار میں تہ انسانی ذہنوں میں ہنوز پختگی آئی تھی، نہ ان کے علم اور تجربہ میں وسعت پیدا ہوئی تھی، اس لئے انہیں زیادہ تر وقتی اور عارضی احکام دیئے جاتے تھے۔ یہ وجہ تھی کہ ان کی طرف جلدی جلدی رسولؑ بھیجے جاتے تھے اور ان رسولوں کا دائرہ کار بھی محدود ہوتا تھا۔ جب مشیت کے پروگرام کے تحت انسانیت پختگی کے دور میں پہنچ گئی (یوں کہیئے کہ جب بچہ جوان ہو گیا)، تو اللہ کی طرف سے ایک ایسا ضابطۂ آئین و قوانین

نازل کر دیا گیا جو عالمگیر انسانیت کے لئے بھی کافی ہو اور آنے والے تمام زمانوں کے تقاضوں کو بھی محیط ہو۔ وہ ہر طرح سے مکمل ہو اور اس میں کسی تغیر و تبدل کی ضرورت نہ پڑے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس کتاب - القرآن - کو نازل کر دینے کے بعد فرمایا کہ:- وَتَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا ۚ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ ۚ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۔ (۶/۱۱۶) "تیرے رب نے جو کچھ انسانوں سے کہنا تھا، اسے اس کتاب میں مکمل کر دیا گیا ہے۔ نیز اس میں مندرج قوانین میں کسی قسم کے تغیر و تبدل کی بھی ضرورت نہیں ہوگی۔ اس لئے کہ یہ ضابطۂ قوانین اُس خدا کی طرف سے نازل کیا گیا ہے جو سب کچھ سُنتا اور سب کچھ جانتا ہے۔" اور سورۃ الحجر میں فرمایا کہ یہ کتاب نہ تو حوادثِ ارضی و سماوی سے ضائع ہوگی اور نہ ہی اس میں کسی قسم کی تحریف ہو سکے گی کیونکہ "ہم نے اس کتاب کو نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کے ذمہ دار ہیں۔" (۱۵/۹)۔ سورۃ القیٰمۃ میں کہا گیا ہے کہ اگرچہ یہ قرآن تھوڑا تھوڑا کر کے نازل ہو رہا ہے لیکن تمہیں "اے رسولؐ! اس کے متعلق فکر کرنے کی ضرورت نہیں، اس کا جمع کرنا اور بحفاظت رکھنا ہمارے ذمہ ہے۔ تمہارے ذمے اس کے احکام و قوانین کا اتباع کرنا ہے۔ (۷۵/۱۷-۱۸)۔ اتباع کرنے کے لئے ضروری ہے کہ اس کے مطالب نہایت وضاحت سے سامنے آجائیں۔ اس کا ذمہ بھی ہم نے خود ہی لے رکھا ہے (۷۵/۱۹)۔" (ہم ایک مضمون کو مختلف آیات میں بار بار لاتے ہیں اور اس طرح پوری پوری وضاحت کر دیتے ہیں۔ یہ ہے قرآن کے سمجھنے کا طریقہ)۔

جیسا کہ اُوپر کہا جا چکا ہے کہ دین کی اصل و بنیاد اس حقیقت پر ہے کہ کسی انسان کو حق حاصل نہیں کہ وہ کسی دوسرے انسان سے اپنی اطاعت کرائے۔ یہ محکومی ہوگی جسے مٹانے کے لئے قرآن آیا ہے (۳/۷۸)۔ اس میں اطاعت کسی انسان کی نہیں بلکہ قوانین و احکام خداوندی کی ہوگی۔ اور اس اطاعت میں خود وہ بھی شامل ہوگا جو ان احکام و قوانین کی اطاعت کرائے گا۔

رسولؐ اللہ نے اپنی نہیں، کتاب اللہ کی حاکمیت قائم کی!

اللہ پر ایمان کا عملی مفہوم کتاب اللہ کی حاکمیت ہے۔ یہی کفر اور ایمان میں حدِ امتیاز ہے۔ جیسا کہ اس نے کہا ہے وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ "وہ جو کتاب اللہ کی حاکمیت قائم نہیں کرتے انہیں کافر کہا جاتا ہے۔" جو حکومت اللہ کے نام سے قائم ہوگی (جسے اسلامی حکومت کہا جائے گا) قانون سازی کے سلسلہ میں اس کا اختیار اتنا ہی ہوگا کہ وہ قرآن میں دیئے گئے اصولوں کی روشنی میں، اپنے اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق، تفاصیل مرتب کرے۔ یہ تفاصیل

دیا جزئی قوانین) زمانے کے تقاضوں کے ساتھ ساتھ قابلِ تغیر و تبدّل ہوں گے لیکن قرآن کے اصول ہمیشہ کے لئے غیر متبدّل رہیں گے۔ دوسرے لفظوں میں اسلامی حکومت کا بنیادی فریضہ قرآنی احکام و قوانین کو معاشرہ میں نافذ کرنا ہے۔ اسی کا نام دین ہے۔ لہٰذا، دین کے قیام و استحکام (تمکن) کیلئے ایک آزاد مملکت کی ضرورت لاینفک ہے۔ اگر اپنی آزاد مملکت نہ ہوگی تو یہ قوانین نافذ کہاں ہوں گے؟
سب سے پہلے اس قسم کی اسلامی حکومت نبی اکرمؐ کی حیاتِ طیبہ میں مدینے میں قائم ہوئی تھی۔
اور اس سلسلے میں اللہ تعالیٰ نے حضورؐ سے ارشاد فرمایا کہ:۔

فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ (۵/۴۸)

"اے رسول! تم ان لوگوں کے معاملات کے فیصلے کتاب اللہ کے مطابق کیا کرو"۔
اور وحیِ خداوندی نے حضورؐ کی زبانِ مبارک سے یہ اعلان کرایا کہ:۔

أَفَغَيْرَ اللّٰهِ أَبْتَغِي حَكَمًا وَهُوَ الَّذِي أَنْزَلَ إِلَيْكُمُ الْكِتٰبَ مُفَصَّلًا (۶/۱۱۵)

"اے لوگو! (جو انسانوں کی حکومت کے خوگر ہو چکے ہو) کیا تم سوچتے ہو کہ میں بھی خدا کو چھوڑ کر انسانی حاکم تلاش کروں حالانکہ اُس نے تمہاری طرف ایک ایسی کتاب نازل کر دی ہے جو اپنی ہر بات کو نکھار کر بیان کر دیتی ہے"۔
آپ نے غور فرمایا کہ وہ جو آیت (۳/۷۸) میں کہا گیا تھا کہ کسی نبی کو بھی اس کا حق حاصل نہیں کہ وہ دوسرے انسانوں پر اپنی حاکمیت قائم کرے، نبی اکرمؐ کی زبان مبارک سے اس طرح واضح الفاظ میں اس کا اعلان کرا دیا۔ بلکہ یہاں تک کہلا دیا کہ:۔

قُلْ إِنِّي أَخَافُ إِنْ عَصَيْتُ رَبِّي عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيمٍ (۶/۱۵)

"اے رسولؐ! ان سے کہہ دو کہ اگر میں بھی خدا کے کسی حکم کی نافرمانی کروں تو میں بھی اس کے عظیم دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں"۔
غور فرمائیے کہ حضور نبی اکرمؐ کو مثال کے طور پر پیش کر کے انسانوں پر انسانی حکومت کے تصور کی کس طرح جڑ کاٹ کر رکھ دی گئی۔
اور پروفیسر ڈاکٹر محمد طاہر القادری صاحب فرماتے ہیں کہ "رسول اکرمؐ کی حاکمیت تسلیم کئے بغیر خالقِ کائنات کی حاکمیتِ اعلیٰ کا تصور مکمل نہیں ہو سکتا"۔ اُن کا یہ کہنا بھی یکسر غلط ہے (غیر قرآنی ہے) کہ "رسولؐ اللہ کی حاکمیت نیابتی اور تفویضی ہے"۔

نیابتی اور تفویضی نظریہ غلط ہے

یہ نظریہ کہ انسان خدا کی نیابت کرتا ہے، قرآنِ حکیم کی رُو سے صحیح نہیں۔ نیابت کے معنی ہوتے ہیں کسی کو اپنے اختیارات تفویض کر دینا۔ (Powers Delegate) کر دینا۔ خدا اپنے اختیارات کسی کو تفویض نہیں کرتا۔ دنیا میں کسی کو خدائی اختیارات (Divine Rights) حاصل نہیں۔ نہ کسی بادشاہ کو۔ نہ مذہبی پیشوا کو۔ حتّٰی کہ نبیؐ کو بھی نہیں۔ خدا نے اپنے مطلق اختیارات سے قوانین مرتّب کئے ہیں۔ خدا کے بندے ان قوانین کو پہلے اپنے آپ پر نافذ کرتے ہیں اور پھر باقی دنیا پر۔ انسان کا فریضہ، قوانینِ خداوندی کی تنفیذ ہے۔ قوانین سازی کے اختیارات اسے تفویض نہیں کئے گئے۔ خدا کا رسول بھی، خدا کا دین (قانون) دنیا تک پہنچاتا اور اسے نافذ کرتا ہے۔ دین بناتا نہیں۔ اس لئے ان معنوں میں انسان خدا کا نائب نہیں۔ البتہ اس سے اگر مفہوم "خدا کے قوانین کو نافذ کرنے والا" لیا جائے تو اور بات ہے۔ لیکن اس کے لئے "نائب" کا لفظ استعمال نہیں کرنا چاہیئے کیونکہ اس سے تفویضِ اختیارات کا باطل مفہوم ذہن میں آجاتا ہے۔

رسول کا فریضہ

رسول کا فریضہ یہ ہے کہ وہ خدا کے پیغامات جو اسے بذریعہ وحی ملتے ہیں انسانوں تک پہنچائے۔ حضرت نوحؑ نے اپنی قوم سے کہا تھا کہ "میں خدا کی طرف سے رسول ہوں۔ میں اللہ کے پیغامات تم تک پہنچاتا ہوں" (۷/۶۲)۔ نبی اکرمؐ کے متعلق ہے بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ مِنْ رَّبِّکَ (۵/۶۷) "جو کچھ تیرے رب نے تیری طرف نازل کیا ہے اُسے دوسروں تک پہنچا دے"۔ لہٰذا رسول اللہ کو جو کچھ خدا کی طرف سے ملتا تھا آپ اسے خود اُمّت کو دیکر گئے تھے۔ اسے دوسروں پر نہیں چھوڑا تھا۔ رسولؐ سب سے پہلے خود اپنی وحی پر ایمان لاتا تھا۔ کہ وہ من جانب اللہ ہے اور صداقتوں سے معمور (۲/۲۸۵) اور سب سے پہلے اس پر عمل پیرا ہوتا تھا۔ یعنی اُس جماعت کا سب سے پہلا رکن ہوتا تھا جسے وہ قوانین خداوندی کی اطاعت اور نظامِ خداوندی کی تشکیل کے لئے وجود میں لاتا تھا (۶/۱۴)۔ وہ اپنے حکم کی اطاعت کسی سے نہیں کراتا تھا۔ نہ ہی یہ چیز کسی رسولؐ کے شایانِ شان تھی کہ وہ انسانوں کو قوانینِ خداوندی کی بجائے اپنے احکام کا محکوم بنائے (۳/۷۸-۷۹)۔ اس طرح رسول کی وساطت سے قوانینِ خداوندی کی اطاعت، خود خدا کی اطاعت قرار پا جاتی تھی (۴/۸۰)۔ لہٰذا یہ اطاعت اُس نظام کی

اطاعت ہوتی تھی جو رسولؐ کے ہاتھوں قوانینِ خداوندی کی عملی تنفیذ کے لئے متشکل ہوتا تھا۔ وحی کا سلسلہ نبی اکرمؐ کی ذاتِ گرامی پر ختم ہو گیا۔ اس کے بعد وہ نظام آگے چلا جو قرآنی قوانین کی رُو سے ، مدینہ میں، خود رسول اللہ کے ہاتھوں ، قائم ہوا تھا۔

اللہ و رسول کی اطاعت سے کیا مُراد ہے ؟

قانونِ خداوندی اپنی مکمل اور آخری شکل میں قرآنِ حکیم کے اندر محفوظ ہے۔ اس کا نام ' الدین ' ہے۔ اس کے مطابق عمل کرنے کو ' الاسلام ' کہتے ہیں۔ اسلام انفرادی زندگی کا نام نہیں۔ یہ ایک اجتماعی نظام کا نام ہے اور اجتماعی نظام میں افرادِ معاشرہ ایک مرکزی اتھارٹی کے فیصلوں کے مطابق چلتے ہیں۔ یہ مرکزی اتھارٹی جس نے سب سے پہلے حکومتِ خداوندی قائم کی تھی خود رسول اللہ تھے۔ حضورؐ خود بھی احکام و قوانینِ خداوندی کی اطاعت کرتے تھے اور دوسروں سے بھی ان کی اطاعت کراتے تھے اس اطاعت کا نام تھا ' اللہ اور رسولؐ کی اطاعت ' یعنی احکامِ خداوندی کی اطاعت ' اس نظام کی رُو سے جیسے رسول اللہ نے قائم فرمایا تھا ، رسولؐ اللہ مرکزی اتھارٹی تھے اور ان کے نیچے افسرانِ ماتحت " اولوالامر "۔ ان افسرانِ ماتحت کے فیصلوں کے خلاف مرکزی اتھارٹی سے اپیل کی جا سکتی تھی۔ لیکن مرکزی اتھارٹی کا فیصلہ آخری ہوتا تھا ۔

لیکن یہ نظام رسول اللہ کی زندگی تک ہی نہیں رہنا تھا۔ اسے آپ کے بعد بھی آگے چلنا تھا۔ چنانچہ یہ آگے چلا۔ اُس وقت یہ مرکزی اتھارٹی حضورؐ کے جانشین (خلفائے راشدینؓ) تھے۔ لہٰذا اس وقت " اللہ و رسول کی اطاعت " سے مراد اُن کے اُن فیصلوں کی اطاعت تھی جو وہ قوانینِ خداوندی کی ترویج و تنفیذ کے سلسلے میں صادر فرماتے تھے۔ اس لئے قرآنِ حکیم نے اطاعت کے لئے اس کی تصریح کر دی ہے۔ سورۃ الانفال میں ہے يَآ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَا تَوَلَّوْا عَنْهُ وَاَنْتُمْ تَسْمَعُوْنَ (۸/۲۰) " تم اللہ اور رسول " کی پوری پوری اطاعت کرو اور اُس کے احکام کو سُن کر ان سے کبھی گریز کی راہیں نہ نکالو "۔۔۔ وَاَنْتُمْ تَسْمَعُوْنَ (درآنحالیکہ تم سُن رہے ہو)۔ لہٰذا اطاعت ایک زندہ محسوس اتھارٹی کے ذریعے ہو گی۔ اس آیۂ جلیلہ میں اللہ اور رسول کی اطاعت کے لئے واحد کی ضمیر (عنہ) استعمال ہوئی ہے۔ جو اس حقیقت کا ناقابلِ تردید ثبوت ہے کہ اللہ اور رسول کی اطاعت ایک اور صرف ایک اتھارٹی ہے۔ (دو کی نہیں)۔ ایسی حکومت جیسے سب سے پہلے نبی اکرمؐ ، اور اُن کے بعد ، حضورؐ کے رفقاء کے ہاتھوں متشکل ہوئی

تھی، عام اصطلاح میں اسے خلافت کہتے ہیں۔ قرآن حکیم نے بھی اسے استخلاف فی الارض کہہ کر پکارا ہے اس حکومت کی فیصلہ کن (Final Authority) کو خلیفہ کہا جاتا ہے۔ اس لفظ کے معنی دراصل "جانشین" کے ہوتے ہیں۔ چونکہ جانشینی میں غلبہ و تسلط اور اختیار و اقتدار کا مفہوم آجاتا ہے، اس لئے "استخلاف فی الارض" کے معنی ہوتے ہیں ملک میں صاحب اختیار ہونا۔ حکومت۔ خلافت بھی انہی معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ لیکن یاد رہے کہ اللہ ہر وقت اور ہر جگہ موجود ہے اس لئے اللہ کے بعد یا اللہ کی عدم موجودگی میں اس کی جانشینی کا تصور ہی باطل ہے۔ جو خود موجود ہو اس کا جانشین کیسا؟ انسان دنیا میں اللہ کی جانشینی کرنے کے لئے نہیں آیا۔ اللہ کے قانون کے مطابق زندگی بسر کرنے اور اس کے قانون کو نافذ کرنے کے لئے آیا ہے۔

سنّت رسول اللہ

اسلام پھر اس وقت صحیح معنوں میں سامنے آئے گا جب معاشرہ میں وہی نظام قائم ہوگا جو "رسول اللہ والذین معہ" کے زمانے میں قائم ہوا تھا۔ یعنی ایسا نظام جس میں قوانین و احکام خداوندی کی اطاعت ایک مرکزی اتھارٹی کے تابع کی جائے اور کوئی انسان کسی دوسرے انسان پر اپنی مرضی نہ چلا سکے۔ ایسی مرکزی اتھارٹی چاہے اس کا نام کچھ ہی کیوں نہ ہو۔ خلیفہ، صدر، امیر، وزیر اعظم، امام، جو قوانین اور احکام خداوندی کی خود اطاعت کرے اور دوسروں سے کرائے یعنی حاکمیت کتاب اللہ (حکومت خداوندی) قائم کرے، جو ایسا کرے اس کی اطاعت "اللہ اور رسول کی اطاعت" تصور ہوگی۔

لہٰذا آج سنّت رسول اللہ سے مراد یہ ہے کہ قرآن کے مطابق دستور مرتب کیا جائے کیونکہ حضورؐ نے اپنا دستور (پہلی اسلامی حکومت کا) قرآن ہی کے مطابق مرتب فرمایا تھا۔ اور یہی رسول اللہ کی سنّت ہے۔ اسی سنّت کے مختلف پہلو سیرت رسول اللہ کے وہ عظیم اور جلیل واقعات ہیں جو قرآن کے اندر محفوظ ہیں۔ لہٰذا "کتاب و سنت" سے مراد اللہ کی کتاب ہے جس کی اتباع رسول اللہ نے فرمائی۔ اسی قرآن کے مطابق ایسا دستور مرتب کیا جا سکتا ہے جو ہر مسلمان کے نزدیک قابل قبول ہو کیونکہ قرآن کے منجانب اللہ ہونے میں کسی مسلمان کو کسی قسم کا شک و شبہ نہیں۔ لیکن ایسے قرآنی دستور کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہمارے اپنے ارباب شریعت ہیں (یعنی مولوی صاحبان)!

تھیاکریسی

ارباب شریعت (مولوی صاحبان) کی طرف سے جو مطالبہ پیش ہو رہا ہے کہ پاکستان میں اسلامی

نظام ہونا چاہیئے، اس کا جذبۂ محرکہ اقتدار کا حصول ہے۔ ان حضرات کا کہنا ہے کہ وہ بتائیں گے کہ اسلامی نظام کیسے کہتے ہیں اور کس طرح چل سکتا ہے۔ جناب پروفیسر محمد طاہر القادری صاحب نے رسول اللہ کی "حاکمیت" کا جو نکتہ اٹھایا ہے وہ اسی اقتدار کے حصول کی ایک کڑی ہے۔ رسول اللہؐ نے تو اپنے آپ کو صرف "اللہ کا بندہ" اور "اللہ کا رسول" کہا ہے۔ انہوںؐ نے کہیں بھی اپنے لئے "تفویضی" یا نیابتی "حاکمیت اعلیٰ" کا دعویٰ نہیں کیا۔ انہوںؐ نے کہیں بھی نہیں کہا کہ اُن کی حاکمیت تسلیم کئے بغیر خالق کائنات کی حاکمیت اعلیٰ کا تصور مکمل نہیں ہو سکتا"۔ البتہ انہوں نے اپنی اطاعت پر ضرور زور دیا ہے کیونکہ اُن کی اطاعت دراصل اللہ کی اطاعت ہے (۴/۸۰)۔ لیکن پروفیسر صاحب کا اصرار ہے کہ اللہ نے اپنی حاکمیت اعلیٰ رسول اللہؐ کو تفویض کی ہے اور اس لئے رسول اللہؐ "اللہ کے نائب" ہیں۔

جیسے پہلے کہا جا چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے بارے میں یہ تصور کہ وہ اپنے اختیارات کسی کو تفویض کرتا ہے بالکل غلط ہے۔ یہ تصور عیسائیوں کے (POPES) کا پیدا کردہ ہے وہ کہتے تھے کہ خدا نے اپنے اختیارات انہیں تفویض کر دیئے ہیں۔ لہٰذا اُن کا حکم خدا کا حکم ہے۔ وہ کہتے تھے کہ وہ خدائی اختیارات کے مطابق انسانوں پر حکومت کرنے کا حق رکھتے ہیں۔ اس کا نام (Divine Rights) خدائی حقوق تھا۔ یہی تصور مسلمان سلاطین نے عیسائیوں سے مستعار لیا۔ اور "السلطان ظِلّ اللہ فِی الارض" (بادشاہ دنیا میں خدا کا سایہ ہے) جیسی روایات وضع کر کے اپنی خدائی فوجداری مستند بنا بیٹھے۔ اب بھی مسلمانوں میں جہاں جہاں ملوکیت ہے وہاں سلطان کو "ظل اللہ" ہی سمجھا جاتا ہے۔ پاکستان میں ملوکیت نہیں، اس لئے مولوی صاحبان کو یہ خیال پیدا ہوا ہے کہ اسلامی نظام کے علمبردار یہی "حاملانِ شرعِ متین" —— ہیں۔ کیونکہ خدا نے، بقول پروفیسر صاحب، اپنے اختیارات رسول اللہؐ کو تفویض کر دیئے ہیں اس لئے اب وہ مولوی صاحبان) بتائیں گے کہ یہ تفویضی اختیارات کیا ہیں اور یہ کیسے پاکستان میں نافذ کئے جا سکتے ہیں! اسی کا نام تو "تھیاکریسی" ہے جسے مٹانے کیلئے اسلام آیا تھا اور جس کے احیاء کے لئے اب اس قدر شور مچایا جا رہا ہے۔

ان مولوی صاحبان نے اُمتِ مسلمہ کو اسلامی نظام تو کیا دینا ہے۔ ہاں البتہ اُمت کو فرقوں میں بانٹ کر رکھ دیا ہے جو شرک کے مترادف ہے (۳۰/۳۱-۳۲)۔ ہر ایک فرقہ اپنی اپنی بولی بول رہا ہے۔ دو بڑے فرقوں کا مطالبہ ہے کہ پاکستان میں "قرآن و سنت" کا نظام نافذ کیا جائے۔ لیکن "سنت" کی تفصیل ان دونوں فرقوں کے نزدیک بالکل مختلف ہے۔ لہٰذا یہ بات قطعاً سمجھ میں نہیں آ سکی کہ وہ کونسا قانون ہو گا جو "سنت" کے مطابق بھی ہو گا اور دونوں فرقوں کے نزدیک متفق علیہ بھی!

اب تو اسلامیہ جمہوریہ پاکستان کے آئین کے آرٹیکل نمبر ۲۲۷ (وضاحتی نوٹ) کے تحت فرقوں

کا وجود ہی تسلیم کر لیا گیا ہے، جو یکسر غیر قرآنی قدم ہے (۳۰/۳۱-۳۲)۔ اب آئین کے آرٹیکل ۲۷ کے وضاحتی نوٹ کے مطابق ہر فرقے کو اختیار دیا گیا ہے کہ جہاں تک پرسنل لاز کا تعلق ہے اُس کی تشریح (اور اس پر عمل) وہ اپنی اپنی کتاب و سنّت، کے مطابق کر سکتے ہیں!

"شیرازہ ہوا ملّتِ مرحوم کا ابتر
اب تو ہی بتا، تیرا مسلمان کدھر جائے۔

(علامہ اقبالؒ۔ ضربِ کلیم)

قرنِ اوّل کی جماعتِ مومنین کے شرف و عظمت کا راز تمسک بالقرآن میں تھا (۴۳/۴۴) لیکن جب بعد میں آنے والوں نے قرآنِ حکیم کو چھوڑ دیا تو ذلیل و خوار ہو گئے۔ یہی وہ شکایت ہے جو نبی اکرمؐ خدا سے کریں گے وَقَالَ الرَّسُوْلُ یٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِی اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا (۲۵/۳۰) "اور رسول کہیں گے کہ اے رب! یہی ہے میری وہ قوم جس نے اس قرآن کو، اپنے خود ساختہ معتقدات کی رسیوں سے اس طرح جکڑ دیا تھا کہ یہ آزادی سے دو قدم چلنے کے قابل بھی نہیں رہا تھا (انہوں نے اپنے آپ کو قرآن کے تابع رکھنے کی بجائے اُسے اپنے مسلک و مشرب کے تابع رکھ چھوڑا تھا)"

"حذر اے چیرہ دستاں سخت ہیں فطرت کی تعزیریں!

اعزاز الدین احمد خان
۷۲۔ای۔ لاہور کینٹ کوا پریٹو
ہاؤسنگ سوسائٹی۔ لاہور چھاؤنی

تصحیح

مجلّہ طلوعِ اسلام شمارہ ۷ جلد ۴۱ بابت ماہ جولائی ۱۹۸۸ء صہ ۶۴، سطر ۲ میں مندرجہ ذیل تصحیح کر لی جائے۔

"ابابیل کے جھنڈ" کی بجائے "پرندوں کے جھنڈ کے جھنڈ"۔

ہم اس سہو پر معذرت خواہ ہیں۔

ادارہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

خالد منصور نسیم

مذہبی فرقے

محترم صدرِ مملکت کے نافذ کردہ شریعت آرڈیننس کی آرٹیکل 2 (e) میں کہا گیا ہے کہ :-

"شریعت سے اسلام کے وہ احکام مُراد ہیں جو قرآن پاک اور سُنّت میں مرقوم ہیں۔

تشریح ..... جیسا کہ دستور کے آرٹیکل 227 میں مرقوم ہے، کسی مسلم فرقہ کے کسی شخصی قانون کے ضمن میں شریعت کی تشریح اور تعبیر میں "قرآن پاک اور سنّت" کے الفاظ سے مراد اس مسلم فرقہ کے مطابق قرآنِ پاک اور سنّت کی تشریح اور تعبیر ہوگی۔"

اس سے مسلمانوں کے مذہبی فرقوں کو مزید سندِ جواز مل گئی ہے۔ اور قرآن اور سنّت کو ان فرقوں کی تشریح و تعبیر کے ماتحت کر دیا گیا ہے۔

آیئے دیکھیں کہ قرآن کریم کے، فرقوں کے بارے میں کیا احکام ہیں؟ ارشادِ باری تعالیٰ ہے کہ ایمان لانے کے بعد، مختلف فرقوں میں بٹ جانا شرک ہے۔

۱۔ ..... وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِينَ ۝ مِنَ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا ۖ كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ ۝ (۳۰/۳۱-۳۲)

"اور تم شرک کرنے والوں میں سے نہ ہو جانا، اُن لوگوں میں سے جنہوں نے اپنے دین میں تفرقہ پیدا کر لیا اور الگ الگ گروہ (فرقہ) بن کر بیٹھ گئے۔ ان میں سے ہر گروہ (یعنی فرقہ) اس طریقہ پر نازاں ہے جس پر وہ چل رہا ہے۔"

۲۔ اس بنا پر کہ فرقوں میں بٹ جانے والے مشرک ہو جاتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ارشادِ خداوندی ہے کہ :-

إِنَّ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِي شَيْءٍ ۚ ... ۝ (۶/۱۵۹)

(اے رسولؐ) جو اپنے دین میں تفرقہ پیدا کر لیں اور الگ الگ گروہ (فرقہ) بن کر بیٹھ جائیں آپ کا ان سے کوئی تعلق نہیں ہے

۳۔ فرقوں میں بٹ جانا اس لیئے شرک ہے کہ فرقوں میں اطاعت خدا کی کتاب کی نہیں ہوتی

بلکہ خدا کی کتاب کو ان فرقوں کے رہنماؤں کی تشریح و تعبیر کے تابع کر دیا جاتا ہے اور وہ لوگ اپنے اپنے فرقے کے متبعین کے لیے خود ساختہ احکام شریعت جاری کرتے رہتے ہیں :۔

اَمْ لَهُمْ شُرَكٰٓؤُا شَرَعُوْا لَهُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا لَمْ يَاْذَنْ بِهِ اللّٰهُ ... ۴۲/۲۱

"کیا ان کے کچھ (خدائی) شریک ہیں جنہوں نے ان کے لیے ایسا دین مقرر کر دیا ہے جس کی خدا نے اجازت نہیں دی۔"

ملاحظہ فرمائیے کہ صورت کیا ہوئی :۔

i۔ دین میں مختلف فرقوں کا وجود، قرآن کریم کی نص صریح کی رُو سے شرک ہے۔

ii۔ فرقوں میں بٹ جانے والوں کا اللہ سے کوئی تعلق نہ رہا کیونکہ یہ شرک ہے (توحید نہیں)

iii۔ جو لوگ فرقوں میں بٹ جائیں قرآن کریم کے ارشاد کے مطابق، رسول اللہ کا ان سے کوئی تعلق نہ رہا۔

اور ہمارا نفاذِ شریعت آرڈیننس، ان فرقوں کو تسلیم کرتے ہوئے انہیں اس قدر اہمیت عطا کرتا ہے کہ قرآن و سنّت کے احکام کو ان کی اپنی تشریح و تعبیر کے تابع کر دیتا ہے۔ یا للعجب!

اس کے بعد، واضعین اور نافذینِ شریعت آرڈیننس اپنے تئیں یہ توقعات رکھتے ہیں کہ اس شریعت آرڈیننس کے نفاذ سے ہم پر اللہ کی رحمتوں کی بارش ہوگی۔ اس سے بڑی خود فریبی یا ابلہ فریبی اور کیا ہوگی؟

آیئے اب دیکھیں کہ ان بزعمِ خویش رحمت کی اُمید رکھنے والوں کو اللہ جلّ شانہٗ نے کس قسم کی وعید سنائی ہے۔

۱۔ اِنَّهٗ مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ وَمَاْوٰىهُ النَّارُ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ○ (۵/۷۲)

"بے شک جو شخص اللہ تعالےٰ کے ساتھ شرک کرے گا اس پر اللہ تعالےٰ جنّت کو حرام کر دے گا۔ اور اس کا ٹھکانہ دوزخ ہے اور ایسے ظالمین کا کوئی مددگار نہیں ہوگا۔"

لیجئے شرک کرنے والوں کیلئے جنّت یُوں حرام کر دی گئی۔

اب آگے ملاحظہ فرمائیے۔

۲۔ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَكَاَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَآءِ فَتَخْطَفُهُ الطَّيْرُ اَوْ تَهْوِيْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ مَكَانٍ سَحِيْقٍ ○ (۲۲/۳۱)

"جو شخص اللہ تعالےٰ کے ساتھ شرک کرے گا تو گویا وہ آسمان کی بلندیوں سے گر

پڑا پھر پرندوں نے اسکی بوٹیاں نوچ لیں یا ہوا نے اس کو کسی دور دراز جگہ میں جا پٹکا"۔ رفعتیں اور بلندیاں بھی چھن گئیں اور انہیں بے یار و مددگار چھوڑ دیا گیا۔

۳۔ لَئِنْ أَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ وَلَتَكُونَنَّ مِنَ الْخَاسِرِينَ (۳۹/۶۵)

اگر تو شرک کرے گا تو تیرا کیا کرایا کام سب غارت ہو جائے گا اور تو خسارہ اٹھانے والوں میں سے ہو جائے گا۔

چلیئے سب کیا دھرا اکارت گیا اور انکے لیئے میزان میں گھاٹا ہی گھاٹا ہے۔

یہ سب اس لیئے کہ گو اللہ کی طرف سے دوسرے گناہوں کی معافی مل جائے گی بشرطیکہ کوئی اس کا طلب گار ہو (یعنی صالح اعمال کرے، حسنات کرے ۱۱/۱۱۴) لیکن شرک کے جرمِ عظیم کا ارتکاب کرنے والوں کو اللہ تعالےٰ ہرگز ہرگز معاف نہیں فرمائیں گے۔

۴۔ إِنَّ اللَّهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُشْرَكَ بِهِ وَيَغْفِرُ مَا دُونَ ذَٰلِكَ لِمَنْ يَشَاءُ ..... (۴/۴۸، ۴/۱۱۶)

یہ ہے انجام جو اللہ تعالےٰ کی وعید کے مطابق شرک کرنے والوں کا مقدر ہے اور جس کی طرف فرقوں پر قائم رہنے والے، اپنے متبعین سمیت اپنے آپ کو لئے جا رہے ہیں۔ انہی کے متعلق قرآن کریم نے کہا ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں:۔

۵ أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ بَدَّلُوا نِعْمَتَ اللَّهِ كُفْرًا وَأَحَلُّوا قَوْمَهُمْ دَارَ الْبَوَارِ ○ (۱۴/۲۸)

کیا آپؐ نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جنہوں نے اللہ کی نعمتوں کو کفر سے بدل دیا اور اپنی قوم کو ایسی منڈی میں لے جا پھینکا جہاں اس جنس کا سدا کوئی خریدار نہ تھا۔

فَاعْتَبِرُوا يَا أُولِي الْأَبْصَارِ (۵۹/۲)

"بصیرت رکھنے والو عبرت حاصل کرو"

اس عبرتناک انجام سے بچنے اور کامیابیوں کی طرف گامزن ہونے کا صرف ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ کہ: وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا ..... ○ (۳/۱۰۳)

"تم سب کے سب مل کر سررشتۂ خداوندی (قرآن) کو تھام لو اور فرقے مت بنو"

یعنی صرف اس دین پر چلو جسے قرآن کریم نے تجویز کیا ہے۔ اپنے تمام معتقدات اور قوانین کو قرآن

ی کسوٹی پر پرکھو۔ جسے وہ صحیح قرار دیدے اسے صحیح سمجھو اور جسے وہ غلط کہہ دے اسے غلط سمجھو
ور اپنے آپ کو صرف مسلمان کہو کیونکہ یہی وہ نام ہے جو تمہارے لیئے تمہارے اللہ نے تجویز فرمایا
ہے:- هُوَ سَمّٰكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ ..... ○ (۲۲/۷۸)

ایک اور قرآنی شمع گُل ہو گئی!

حلقۂ طلوعِ اسلام کی معروف شخصیت، بانیٔ تحریک محترم پرویزؒ صاحب کے دیرینہ رفیق اور طلوعِ اسلام ٹرسٹ کے نیجر ایڈمنسٹریشن، محترم حسن عباس رضوی صاحب جو اپریل ۱۹۸۸ء سے بعارضۂ دل علیل چلے آرہے تھے اور بظاہر رُو بصحت ہو رہے ے جمعہ، مورخہ ۱۵ جولائی ۱۹۸۸ء کی شب شدید دورۂ قلب پڑنے سے ہسپتال داخل ہوئے اور بیہوشی کے عالم میں اتوار، مورخہ ا جولائی ۱۹۸۸ء کی شام، اس دارِ فانی سے رحلت فرما گئے۔ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ!

مرحوم رضوی صاحب نے تحریکِ طلوعِ اسلام اور خالص قرآنی فکر کی نشر و اشاعت میں قابلِ تحسین اور گراں بہا خدمات ام دیں اور بالخصوص کوئٹہ میں اپنے طویل قیام کے دوران، بزمِ طلوعِ اسلام کوئٹہ کے روحِ رواں رہے۔ ی دوران انہوں نے، ۱۹۶۵ء میں وہاں پر طلوعِ اسلام سب کنونشن کا اہتمام بھی کیا جس موقع پر کوئٹہ میں محترم ویزؒ صاحب کی موجودگی سے بھرپور استفادہ کرتے ہوئے، انہوں نے وہاں متعدد نجی محفلوں کا انصرام کیا جس ے کوئٹہ کی فضائیں محترم پرویزؒ صاحب کی قرآنی فکر سے گونج اُٹھیں۔ مرحوم کی اِن حسن کارانہ کاوشوں کی صدائے زگشت، کوئٹہ سے آج بھی سنائی دیتی ہے۔

محترم رضوی صاحب، قرآنی فکر کی ایک فاضل شخصیت ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے رفقا اور دوستوں حلقہ میں بھی بے حد مقبول تھے۔

پچھلے سال جولائی سے، انہوں نے اراکینِ طلوعِ اسلام ٹرسٹ کے بے حد اصرار پر ٹرسٹ کے مینیجر ایڈمنسٹریشن فرائض سنبھالے جنہیں وہ اپنی علالت تک نہایت تندہی اور جانفشانی سے نبھاتے رہے۔

اُن کی وفات سے حلقۂ طلوعِ اسلام میں جو خلا پیدا ہو گیا ہے اُسے دیر تک محسوس کیا جاتا رہے گا۔

دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ، اُن کے اہلِ خانہ اور قرآنی رفقاء کو اس جانکاہ صدمہ کو برداشت کرنے کی ہمت و توفیق فرمائے اور اس کی کائناتی قوتیں محترم رضوی صاحب کا استقبال اس نویدِ جانفزا سے کریں کہ:-

يٰۤاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ○ ارْجِعِيْۤ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ○ فَادْخُلِيْ فِيْ عِبٰدِيْ ○ وَادْخُلِيْ جَنَّتِيْ ○ (۸۹/۲۷-۳۰)

ادارہ

محترمہ ثریا عندلیب

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

"فرقہ وارانہ ہم آہنگی"؟

اِدھر کئی برسوں سے ہمارے رہبرانِ قوم اور علمائے کرام نے ایک مخصوص اصطلاح وضع کر رکھی ہے، جس کا آئے دن اخبارات، بیانات، اور مذاکرات میں چرچا ہوتا رہتا ہے اور قوم کو خاص طور پر اس طرف متوجہ کیا جاتا ہے کہ ملک کو انتشار و فساد سے محفوظ رکھنے اور آپس کے اختلافات اور نااتفاقی کو دور کرنے کا صرف ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ کہ "فرقہ وارانہ ہم آہنگی" اختیار کی جائے۔ جی ہاں! فرقہ وارانہ ہم آہنگی ہی وہ نئی اصطلاح ہے۔ جسے اس دورِ بے طور میں زبان زدِ عام بنایا جا رہا ہے۔ لیکن آپ کیوں چونک اٹھے! ہاں آپ کو دو متضاد لفظوں کا جوڑ قبول نہیں۔ قبول ہو بھی کیسے؟ کہاں فرقہ بندی، کہاں ہم آہنگی؟ ایک کو دوسرے سے کوئی نسبت ہی نہیں۔ کبھی فرقوں کی صورت میں الگ الگ ہو کر ایک ہی فکر اور ایک ہی عمل (ہم آہنگی) کو اپنایا جا سکتا ہے؟ (فرقوں کا تو وجود ہی ان اختلافات کا مرہونِ منت ہے) تاریکی اور روشنی کا ملاپ کبھی کسی نے دیکھا ہے؟ رات اور دن کبھی اکٹھے ہوئے ہیں؟ یہ حقیقتیں اپنی جگہ اور مذہب اسلام کے حاملین کی "میں نہ مانوں" اپنی جگہ۔ جب اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ "الدِّین" کو مذہب کا چولا پہنا دیا گیا تو ایمان و عقائد اور تصورات و نظریات سب کا نقشہ ہی بدل گیا۔ دین کی "مشکلیں" بھی ختم ہو گئیں۔ مزے سے اپنا اپنا فرقہ بناؤ اور اسے ہی ناجی سمجھتے ہوئے دُنیا کے عیش اُڑاؤ۔ اس کے ساتھ ہی "فرقہ وارانہ ہم آہنگی" کا ڈھول پیٹتے جاؤ۔ تاکہ فرقوں کے قیام کے لئے مزید استحکام کی صورت پیدا ہوتی چلی جائے۔ رہ گئی ہم آہنگی تو آخر زیبِ داستان کے لئے بھی تو دل نشین الفاظ کا استعمال ضروری ہوتا ہے!

اگر بحیثیت مسلمان ہم اپنے ضابطۂ حیات قرآنِ کریم کی آیاتِ بیّنات کو سامنے رکھ کر دیکھیں تو ہمیں نظر آئے کہ یہ فرقہ وارانہ ہم آہنگی درحقیقت اپنے فرقے کے تحفظ کی خاطر فریب دہی اور فریب خوردگی کا دوسرا نام ہے۔ یا شرک اور توحید کو مدغم کرنے کی ایک سعیٔ ناکام ہے۔ ایک طرف ہم کہتے ہیں کہ توحید پر ہمارا ایمان ہے، ہم اللہ کی وحدانیت کو تسلیم کرتے ہیں۔ دوسری طرف فرقہ بندی ہمارا شعار ہے، جو اللہ کے اقتدار و اختیار میں انسانوں کو شریکِ کار بناتا ہے۔ یعنی ہمیں مشرک بناتا ہے، مگر ہمیں اس سے انکار ہے۔ ہم اللہ کے اس فرمان کی طرف دھیان نہیں دیتے۔ بلکہ اس طرف سے اپنی آنکھیں بند کر لیتے ہیں۔

اور کانوں میں ڈاٹ دے لیتے ہیں۔ جب قرآن یہ اعلان کرتا ہے کہ:۔

لَا تَكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِينَ مِنَ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا ۖ كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ ۳۰/۳۱-۳۲

(توحید کے پیرو ہو کر) پھر سے مشرک نہ بن جاؤ یعنی ان لوگوں میں سے نہ ہو جاؤ جنہوں نے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور اس طرح اُمّتِ واحدہ رہنے کے بجائے مختلف فرقوں میں بٹ گئے (اس سے ہوتا یہ ہے کہ) ہر فرقہ سمجھتا ہے کہ جس طریقے پر ہم چل رہے ہیں وہی حق و صداقت کی راہ ہے اس لئے وہ اپنے آپ میں مگن ہو کر بیٹھ جاتے ہیں"۔ (مفہوم القرآن)

کیا ہمارا معاشرہ جو اپنے آپ کو اسلامی معاشرہ سمجھتا ہے، اس فرمانِ خداوندی کی ہُوبہو تصویر پیش نہیں کر رہا؟ فرقہ بندی تو اتنا سنگین جرم ہے کہ قرآن بار بار یہ وارننگ دیتا ہے کہ:۔

وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ تَفَرَّقُوا وَاخْتَلَفُوا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْبَيِّنَاتُ ۚ وَأُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ۳/۱۰۴

"یاد رکھو تم کہیں ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جو واضح قوانینِ خداوندی آجانے کے بعد بھی فرقوں میں بٹ جائے اور باہم دگر اختلافات کرنے لگ گئے۔ (وہ جان لیں کہ) اس کی سزا بڑی سخت ہے۔ (اس کا انجام بہت بُرا ہے) اس سے قومیں ذلیل و خوار اور تباہ و برباد ہو جاتی ہیں"۔

کیا ہو گیا ہے ہمیں کہ اپنی فرقہ بندی سے وہی نتیجہ ہم بھگت بھی رہے ہیں جو قرآن قدم قدم پر ہمیں بتا رہا ہے، اس کے باوجود ہم بدستور اپنی اسی روش پر ڈٹے رہتے ہیں، بلکہ فرقہ بندی کے جواز کیلئے طرح طرح کی تاویلیں ڈھونڈ رہے ہیں یا خوش نما الفاظ سے کھیل رہے ہیں! قرآن بتا رہا ہے کہ — فرقہ بندی اختلافات سے جنم لیتی ہے اور پھر مزید اختلافات پیدا کرنے کا ذریعہ بنتی ہے (اور کبھی کسی نے آپس کے اختلافات کو "ہم آہنگ" ہوتے بھی دیکھا ہے؟) مگر ہم ہیں کہ "فرقہ وارانہ ہم آہنگی" کی تلقین کئے چلے جا رہے ہیں۔ یہ جانتے بوجھتے ہوئے کہ ایسا کبھی نہیں ہو گا۔ (ہو نہیں سکتا کہ الگ الگ فرقے قائم بھی رہیں اور اپنے اپنے مسلک و مشرب کے ساتھ سب ایک بھی ہو جائیں)۔ اس لئے خطرہ کی کوئی بات نہیں بلکہ ہم آہنگی کی تلقین کر کے "نیکی" کرنے کا ثواب، حاصل ہو جائے گا: ؎

واۓ ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا
کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

اس صورتِ حال کے باوجود ہمارا دعویٰ یہ ہے کہ ہم بنی آخر الزمان حضور نبی اکرم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے

اُمتی ہیں۔ ان کی سنّت کے پیرو ہیں۔ جبکہ قرآن نے نبی اکرمؐ کو مخاطب کر کے کھلے کھلے الفاظ میں یہ فیصلہ کر دیا ہے کہ:-

اِنَّ الَّذِیْنَ فَرَّقُوْا دِیْنَھُمْ وَکَانُوْا شِیَعًا لَّسْتَ مِنْھُمْ فِیْ شَیْءٍ ط (۶/۱۶۰)

"بیشک جو لوگ اپنے دین میں تفرقہ پیدا کر لیں اور الگ الگ گروہ بن جائیں۔ اے رسولؐ! تیرا ان سے کوئی واسطہ نہیں"۔

وحیٔ خداوندی کیا کہہ رہی ہے؟ یہ کہ فرقوں میں بٹ جانے والوں سے اللہ کے رسول کا بھی کوئی واسطہ نہیں، لیکن ہم ہیں کہ حضورؐ کا نام لیتے یا سنتے ہوئے اپنی انگلیاں چوم چوم کر اپنی آنکھوں پہ لگاتے ہیں اور اس دنیک عمل سے بزعمِ خویش یہ سمجھتے اور ثابت کرتے ہیں کہ ہم رسولؐ کے ہیں اور رسولؐ ہمارے ہیں پھر یہ بھی ہماری ہی کیفیت ہے کہ یہ بتانے کے لئے کہ ہم کون ہیں، مسلمان، لفظ کو نہ صرف ناکافی سمجھتے ہیں بلکہ صرف مسلمان کہنے کہلوانے سے ہماری "ذات" کا تعیّن نہیں ہوتا۔ "کون سا مسلمان بتائے بغیر" مسلمان، ہم سمجھے ہی نہیں جا سکتے۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰہ تو اسی وقت کہا جاتا اور کہا جا سکتا ہے جب ہم مسلمان کے ساتھ حنفی ہوں۔ شافعی ہوں۔ مالکی ہوں حنبلی ہوں دیوبندی ہوں۔ بریلوی ہوں سنّی ہوں، شیعہ ہوں۔ وغیرہ وغیرہ۔ مگر ذرا رُکیے۔ یہ اَلْحَمْدُ لِلّٰہ حنفی نے حنفی کے لئے۔ شافعی نے شافعی کے لئے اور اسی طرح مالکی، حنبلی، دیوبندی، بریلوی وغیرہ سب نے اپنے اپنے فرقے سے منسلک مسلمان کے لئے کہنا ہے اور لازماً دوسرے فرقوں کو رَدّ کرنا ہے کہ یہی تو فرقہ بندی کی اوّل و آخر شرط ہے۔

الگ الگ فرقے کے ساتھ دوسرے کی تردید بھی کرتے جائیں اور ساتھ ہی ساتھ "فرقہ وارانہ ہم آہنگی" کی تائید بھی، یا للعجب! یہ حقیقت بھی ہمارے سامنے ہے کہ ہم میں سے ہر فرقہ سنّت رسول اللہؐ کا پیروکار ہونے کا دعویدار ہے۔ اور سنّتِ رسول اللہؐ کا تعیّن حضورؐ کی احادیث کی رُو سے کیا جاتا ہے۔ اور احادیث بھی ہر فرقہ کی الگ الگ ہیں۔ یہی الگ الگ حدیثیں ہمارے ہاں کے جُدا جُدا فرقوں کی بنیاد ہیں، پھر اپنے ان وضعی اور خود ساختہ عقائد اور نظریات کے تابع قرآن مبین کا ترجمہ اور تفسیر کرنا اگر کھلا ہوا شرک نہیں تو اور کیا ہے؟ ہم میں دو بنیادی فرقے شیعہ اور سنّی ہیں۔ دونوں کا یہی دعویٰ ہے کہ رسولِ اکرمؐ کا وہی مذہب تھا جس کے پیرو وہ ہیں۔ اسی پر ہی بس نہیں۔ سُنّیوں میں اہلِ حدیث اور اور اہلِ فقہ بھی تو ہیں۔ کس کس کا نام لیا جائے۔ اللہ نے تو ہمارا یعنی پوری جماعتِ مومنین کا ایک ہی نام رکھا تھا اور اپنے رسولؐ کی زبانِ مبارک سے یہ کہلوایا تھا کہ

اَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ (۶/۱۶۳)

"میں سب سے پہلا مسلم ہوں اور یہ نام خود خدا کا مقرر کردہ ہے"۔

هُوَ سَمّٰكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ مِنْ قَبْلُ وَفِيْ هٰذَا ۲۲/۷۸

"خود خدا نے تمہارا نام مسلم رکھا تھا قرآن سے پہلے بھی"۔

یہ وحیٔ خداوندی ہے مگر ہمیں "خالی مسلمان" پکارے جانا منظور نہیں۔ فرقے کے ساتھ ہماری مسلمانی مانتے ہو تو سو بسم اللہ رسولؐ کا دین تو وہی ایک تھا جو قرآن کی صورت میں نازل ہوا۔ اور آنحضورؐ کی سنّت اسی قرآن کے تابع رہی۔ مگر ہم اس ذاتِ اقدس و اعظمؐ کے نام لیوا ہوتے ہوئے بھی صرف ستّر نہیں ستّر ہزار فرقوں، گروہوں اور پارٹیوں میں بٹے ہوئے ہیں اور اسی اعتبار سے ہم نے دینِ توحید کی سینکڑوں شکلیں بنا دی ہیں۔ صرف اس لئے کہ ہمارے فرقوں کو کوئی گزند نہ پہنچے۔ اسلئے ہم مذہبِ اسلام، کا پرچار کئے جا رہے ہیں، کہ وہی ان کا محافظ ہے۔ اس دین کو جس کا نام اسلام ہے 'مذہب' میں بدلنے یا مذہب بنا دینے کا مقصد ہی یہ تھا کہ خدا کی عطا کردہ زندگی اس کی مرضی کی بجائے اپنی مرضی کے مطابق بسر کی جائے تاکہ بلا روک ٹوک جو جی میں آئے خود کرتے ہوئے دوسروں کو بھٹکاتے چلے جائیں۔ ہم مگن ہیں اس میں کہ ہمیں ہمارا مقصد حاصل ہو گیا۔ اب ہے کوئی مائی کا لال جو ہمیں اس 'دلدل' سے باہر نکال سکے! اب ہم نے اس سلسلہ میں مزید کارگزاری یہ کی ہے کہ "فرقہ وارانہ ہم آہنگی"، نئی نکور اصطلاح رائج کر کے فرقہ بندی کی مخالفت کرنے والوں کے گویا منہ بند کر دیئے ہیں۔ مگر انسان، انسان کو ہزار دھوکہ دے لے وہ خالقِ انسان کو دھوکا کبھی نہیں دے سکتا۔ اس نے ہم بندوں کی رہنمائی کے لئے جو کتابِ مبین نازل کی ہے، اپنے احکام و قوانین کے ساتھ، مستقل اصول و اقدار پر مشتمل، ان کو نہ ماننے اور اُن کے مطابق زندگی بسر نہ کرنے سے اس کتابِ مبین کا تو کچھ نقصان ہو گا نہ اس کی صداقت مٹ سکے گی۔ نقصان تو ہم نے ہی اپنی اس روش کے ہاتھوں اٹھانا ہے اور اٹھا رہے ہیں۔ کاش ہم نے "فرقہ وارانہ ہم آہنگی" کی جگہ "فرقہ شکنی" کی مہم چلائی ہوتی۔ تو آج ہمارا یہ حالِ بد نہ ہوتا جو دُنیا بھی دیکھ رہی ہے اور جسے ہم خود بھی دیکھ رہے ہیں۔

فاعتبروا یا اولی الابصار!

قارئینِ طلوعِ اسلام کو عیدِ مبارک

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اہلحدیث علماء کا معیارِ تحقیق و اخلاق

(مدیر طلوعِ اسلام کے قلم سے)

فرقہ اہلِ حدیث کے علماء نے اسلامی علوم کی تحقیق کیلئے ایک ادارہ مجلس التحقیق الاسلامی قائم کر رکھا ہے۔ اس ادارے کی کوئی ایسی علمی تحقیق تو سامنے نہیں آئی کہ جس سے ملک و ملت یا اہلِ وطن کو کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہو، البتہ اس کا سارا زور محترم پرویز صاحب پر کیچڑ اُچھالنے میں صرف ہو رہا ہے۔ اس ادارے کے ترجمان ماہنامہ محدث کی جون ۱۹۸۸ء کی اشاعت میں ایک مضمون شائع ہوا ہے۔ جس کا عنوان ہے "خدا اور رسول یا مرکزِ ملت"۔ "قرآنِ کریم کی روشنی میں" اس مضمون میں پرویز صاحب کے اس نظریئے پر تنقید کی گئی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی اطاعت سے مراد مرکزِ نظامِ اسلامی (اسلامی حکومت) مُراد لیتے ہیں چونکہ اس سلسلے میں ان حضرات نے پرویز صاحب کا نقطۂ نظر نقل کرنے میں بددیانتی سے کام لیا ہے۔ اسلئے ہم نے طلوعِ اسلام کی اسی اشاعت میں پرویز صاحب کا یہ نقطہ انہی کی زبانی ایک الگ مضمون کی صورت میں پیش کر دیا ہے۔ جس سے ان حضرات کی بددیانتی کا پردہ چاک ہو جائے گا۔

ان کے اعتراضات کا جواب دینے سے پہلے یہ ملاحظہ ہو کہ پرویز صاحب نے اس بارے میں جو نظریہ پیش کیا ہے، خود قرآنِ مجید کی متعدد آیات سے اس کی تائید ہوتی ہے۔ اس سلسلے میں سورۃ التوبہ کی دو آیات پیش کی جاتی ہیں۔

يَحْلِفُونَ بِاللَّهِ لَكُمْ لِيُرْضُوكُمْ ۚ وَاللَّهُ وَرَسُولُهُ أَحَقُّ أَنْ يُرْضُوهُ إِنْ كَانُوا مُؤْمِنِينَ ۝ (۹/۶۲)

اس آیت میں اللہ اور رسول جس کے لئے عربی قائدے کے مطابق ضمیر تثنیہ آنی چاہیئے تھی واحد (یُرْضُوہُ میں ہٗ کی ضمیر) لائی گئی ہے۔ حالانکہ اللہ اور رسول ایک نہیں، اللہ، خالق ہے، اور رسول مخلوق ہے، پیغام دینے والا اور پیغام پہنچانے والا ایک نہیں ہو سکتا، لیکن اس آیت میں ان دونوں کیلئے ضمیر واحد ملا کر انہیں ایک ٹھہرانے سے صاف ظاہر ہے کہ اس آیت میں اللہ اور رسول کے الفاظ اصطلاح کے طور پر کسی ایسی چیز کے لئے لائے گئے ہیں، جو ایک ہیں دو نہیں۔ اور ظاہر ہے کہ اس ایک چیز سے مراد اللہ تعالیٰ کا عطا کردہ وہی نظام ہے، جو رسول اللہ کی معرفت اس دنیا میں قائم کیا گیا۔

اسی سورت کی آیت ۷۴ کے الفاظ ہیں اَغْنٰهُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ مِنْ فَضْلِهٖ۔ یہاں بھی اللہ اور اُس کے رسُول کے لئے واحد کی ضمیر (ہٗ) لائی گئی ہے، یعنی خالق و مخلوق کا ذکر کر کے ان کے لئے واحد کی ضمیر لائی گئی ہے، تو اس سے اسلامی نظام کے علاوہ اور کیا مُراد ہو سکتا ہے کیونکہ یہ نظام اللہ تعالیٰ کے پیغام کے ذریعے اس کے پیغمبرؐ نے اس دنیا میں قائم کیا تھا۔

اہلِ حدیث حضرات کے تنقیدی مضمون کا عنوان تو تھا "قرآن مجید کی روشنی میں"، لیکن انہوں نے یہ عنوان صرف دھوکا دینے کے لئے قائم کیا تھا۔ اور جیسا کہ اُوپر والی دو قرآنی آیات سے پرویزؒ صاحب کے نقطۂ نظر کی تائید ہوتی ہے ان حضرات نے جان بوجھ کر ان آیات سے چشم پوشی کی۔ اس کی بجائے وہ اپنی تحقیق کی ابتداء ایک عقلی دلیل سے کرتے ہیں جسے ان ہی کے الفاظ میں پیش کیا جاتا ہے۔

"۱۔ زید نے کھانا کھایا۔ ۲)۔ زید نے آم کھایا۔

دونوں جملوں کو بغور پڑھیئے۔ پہلے جملے میں فعل خوردن کا مفعول کھانا ہے اور دوسرے میں آم۔ کیا یہ درست ہوگا کہ ہم کھانا کا معنی آم کر ڈالیں۔ اور اگر نہیں تو اس شخص کا معاملہ کس قدر پُر فریب ہے جو کھانا کا معنی آم کر ڈالنے پر محض اس لئے مصر ہے۔ کہ کھانے کی جگہ اگر آم رکھ دیا جائے تو جملے میں کوئی ابتری واقع نہیں ہوتی، اور اس صورت میں بھی جملہ بامعنی ہی رہتا ہے۔ آپ جس قدر چاہیں شور مچائیں کہ لغت کی کتابیں کھانا، بمعنی 'آم' کے مفہوم سے قطعاً خالی ہیں، مگر وہ صاحب یہی فرمائے جا رہے ہیں کہ کتبِ لغت اس سے خالی ہوں، مگر کھانا کی جگہ 'آم' رکھ دینے سے جملے کی ترکیب و ساخت میں کوئی فرق نہیں پڑتا لہٰذا کھانا کا لغوی مفہوم 'آم' نہ سہی، مگر مُرادی مفہوم تو بہرحال 'آم' ہے، بالکل یہی حال مسٹر پرویز نے قرآن پاک کی آیات کا کیا، جن میں اللہ اور رسول کی اطاعت کا ذکر ہے۔ وہ اللہ اور رسول سے مراد دو ذوات کو نہیں لیتے۔ جن میں سے ایک فاطرُ السّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ہے اور دوسری اس کی طرف سے مامور وہ محترم شخصیت ہے کہ جس کی زندگی اہلِ ایمان کے لئے اسوۂ حسنہ ہے۔ بلکہ وہ اللہ اور رسول سے مراد مرکزِ نظام اسلامی یا مرکزِ ملّت لیتے رہے۔"

(ماہنامہ محدث بابت جون ۱۹۸۸ء صفحات ۵۲۶ و ۵۲۷)

اہلحدیث علماء کی جانب سے اللہ، رسول اور اسلامی نظام کی وضاحت کے لئے پیش کی جانے والی اس مثال کی رکاکت ملاحظہ ہو کہ جس میں اللہ اور اس کے رسول کو کھانے سے اور اسلامی نظام کو 'آم' سے تشبیہ دی گئی ہے پھر ان کی جہالت معلوم ہو کہ وہ اس مثال سے یہ ثابت کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اور رسولؐ سے مراد دو ذوات ہیں، ان سے مُراد ایک چیز نہیں لی جا سکتی۔ ان کے اس اقتباس سے

پہلے، ہم قرآن مجید کی سورۃ التوبہ کی دو آیات ۶۲، ۶۳ نقل کر چکے ہیں، جس میں خود قرآن مجید میں ان دو ذوات کے لئے واحد کی ضمیر استعمال کی گئی ہے اور وہاں اس واحد کی ضمیر کی وجہ سے ان سے مراد کوئی ایک چیز لینے کے سوا کوئی چارہ نہیں، اور وہ ایک چیز وہ نظام ہے، جو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولؐ کی معرفت اس دنیا میں قائم کیا لیکن جو حضرات قرآن مجید کو اپنے پیٹ کے مسئلے کے لئے استعمال کرتے ہوں، ان کے لئے قرآن مجید کے ان واضح احکامات کو سمجھنا ممکن نہیں۔

پھر حیرت کی بات یہ ہے۔ کہ سورۃ النساء کی آیت ۵۹ کے یہ معانی صرف پرویزؔ صاحب نے ہی بیان نہیں کئے بلکہ جدید و قدیم تمام مفسرین نے بیان کئے ہیں۔ اس سلسلے میں پرویزؔ صاحب نے اسی آیت کی تفسیر کے حاشیے ہیں سیّد ابو الاعلیٰ مودودی صاحب کا بھی ایسا ہی مسلک ان الفاظ میں نقل کیا ہے:

"زمین سے مراد یہاں وہ ملک یا علاقہ ہے، جس میں امن و انتظام قائم کرنے کی ذمہ داری اسلامی حکومت نے لے رکھی ہو اور خدا اور رسول سے لڑنے کا مطلب، اُس نظامِ صالح کے خلاف جنگ کرنا ہے جو اسلام کی حکومت نے ملک میں قائم کر رکھا ہو۔"

(تفہیم القرآن جلد اول صفحہ ۴۶۵ ایڈیشن ۱۹۵۱ء)

اہلِ حدیث علماء نے جس آیت کی تفسیر کو اپنی تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔ اسی آیت کے نیچے مودودی صاحب کی تفسیر کا یہ اقتباس بھی دیا ہوا ہے اور ان کی رکیک مثال کے مطابق مودودی صاحب نے بھی کھانے کی بجائے آم، رکھ دیا ہے۔ لیکن ان صالح حضرات نے پرویزؔ صاحب پر تو کیچڑ اُچھالا ہے۔ لیکن مودودی صاحب کا نام تک نہیں لیا۔ کیا یہ اہلحدیث اخلاقیات کا حصہ ہے؟

ذرا اور آگے چلئے، ان کی جہالت اور بدنیتی کا بھانڈا چوراہے میں پھوٹتا ہے۔ اہلِ حدیث کے سب سے بڑے عالم علامہ ابو الوفا ثناء اللہ امرتسری صاحب نے اس آیت کی تفسیر میں اپنے ترجمہ قرآن میں یہ بیان کیا ہے:۔

'ابن عبّاس کا قول ہے کہ جس نے اسلام میں ہتھیار نکالے اور راہ گیروں کی تخویف و فساد کیا، پھر وہ گرفتار ہوا تو مسلمانوں کے امام کو اس کے حق میں اختیار ہے کہ حسبِ موقع چاہے تو اسے قتل کر دے یا چاہے سولی دے اور چاہے اس کے ہاتھ پاؤں کاٹ دے۔ یہی قول بیشتر علماء کا ہے (ابن جریر)

(قرآنِ مجید ترجمہ و تفسیر از مولانا ابو الوفا ثناء اللہ امرتسری شائع کردہ فاروقی کتب خانہ ملتان صفحہ ۱۳۵، پہلی سطر)

دیکھئے اس تفسیر میں خود اہلِ حدیث کے ایک امام حارب اللہ و رسولہٗ کی دو ذوات کے لئے ایک چیز

یعنی "اسلام" کا ذکر کر رہے ہیں یہی نہیں بلکہ وہ اُمّتِ مسلمہ کے تمام علماء کا یہی مسلک بیان کر رہے ہیں۔ اس سے موجودہ دَور کے نیم تعلیم یافتہ اہلِ حدیث حضرات کے مبلغ علم کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ اور وہ پرویز صاحب پر کیچڑ اُچھالنے میں اتنے اندھے ہو گئے ہیں کہ خود اپنے امام اور اُمّت مسلمہ کے تمام اہلِ علموں کو اس گندگی کی زد میں لے آئے ہیں۔ پرویز صاحب نے بھی تو یہی کہا تھا کہ رسول اللہ صلعم کی وفات کے بعد، اللہ اور رسولؐ سے مُراد نظام خداوندی ہے۔ اور یہ حضرات بھی یہی کچھ فرما رہے ہیں۔

دراصل قرآن مجید کو ان بیچاروں نے کبھی ہاتھ تک نہیں لگایا۔ ان کے نزدیک جو کچھ اسلام ہے وہ متقدمین کی روایات میں ہے۔ ہم انہیں انہی کے حوالے سے ثابت کر کے دکھاتے ہیں کہ ہمارے متقدمین کے نزدیک بھی۔ اللہ اور رسول کے معنی امام وقت یعنی اسلامی حکومت کا سربراہ، کے لئے گئے ہیں۔

(۱) امام ابن جریر طبری سورۂ انفال کی پہلی آیت میں قُلِ الْاَنْفَالُ لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ کی تفسیر میں مختلف اقوال نقل کرنے کے بعد اپنا فیصلہ یہ لکھتے ہیں:-

واولی هٰذه الاقوال بالصواب فی معنی الانفال قول من قال هی زیادات یزیدها الامام لبعض الجیش او جمیعهم۔

"انفال کے معنی کے متعلق ان تمام اقوال میں سے قرینِ صواب ان لوگوں کا قول ہے جنہوں نے کہا ہے کہ یہ وہ اضافے ہیں جو امامِ وقت بعض یا کل فوج کے لئے کرتا ہے"

یہاں انفال کے معنی سے بحث نہیں، مدعا صرف یہ ہے کہ اللہ اور اس کے رسول کی تفسیر انہوں نے امامِ وقت لکھی ہے۔

(۲) امام رازی نے آیت ۵/۳۳ اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِيْنَ يُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ کے تحت میں امام ابوحنیفہؒ کا یہ قول نقل کیا ہے۔

قال ابوحنیفه اذا قتل واخذ المال فالامام مخیّر فیه بین ثلاثه اشیاء

"امام ابوحنیفہؒ نے فرمایا ہے کہ اگر باغی یا ڈاکو نے قتل بھی کیا ہے اور مال بھی لیا ہے تو امام کو اختیار ہے کہ تینوں سزاؤں (قتل، قطع اور صلب) میں سے جو سزا چاہے اُس کو دے۔

(۳) اس آیت کی تفسیر میں علامہ جلال الدین سیوطی، الدرّ المنثور میں یہ روایت درج کرتے ہیں۔

عن سعید بن المسیب والحسن والضحاک قالوا الامام مخیّر فی المحارب یصنع به ما یشاء

"سعید بن مسیب، حسن بصری اور ضحاک نے کہا ہے کہ محارب کے معاملہ میں امام کو اختیار ہے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اللہ اور اسکے رسول کی اطاعت

سے کیا مُراد ہے؟

محترم پرویز صاحب

اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت قرآن مجید کا ایک اہم موضوع ہے۔ اس موضوع کی وضاحت سورۃ النساء کی آیت ۵۹ سے ہوتی ہے۔ یہ آیت وہ ہے جو:۔
"نظامِ خداوندی (یا اسلامی مملکت) کا عُروۃ الوثقیٰ ہے اور جس کا غلط مفہوم اُمّت کی تمام اختلافات انگیزیوں اور تفرقہ بازیوں کا موجب ہے اور وہ آیت یہ ہے۔

يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا (۴/۵۹)

اس آیت کا مروّجہ ترجمہ اور صحیح مفہوم بعد میں پیش کیا جائے گا۔ پہلے اس پس منظر کو دیکھیے جس میں اس آیت نے بنیادی اہمیت حاصل کر رکھی ہے۔

اس وقت تک قرآن کریم کا جتنا حصّہ آپ کے سامنے آچکا ہے، اس سے آپ نے اس حقیقت کو تو سمجھ لیا ہوگا کہ اس کی بنیادی تعلیم یہ ہے کہ حکومت یا اطاعت صرف خدا کی ہے۔ اُس کے سوا کسی کی نہیں۔ یہی الدّین کی لِم ہے۔ یہی الاسلام کی غایت ہے۔ یہی توحید ہے۔ یہی خدا پر ایمان کا مقصدِ اوّلین ہے۔

قرآن کا سیاسی نظام

لیکن خدا کی ذات تو ایسی ہے کہ اس کا محسوس اور مرئی طور پر ہمارے سامنے آنا تو ایک طرف وہ ہمارے قیاس وخیال، گمان و وہم سے بھی ماوراء ہے۔ اس سے سوال پیدا یہ ہوتا ہے کہ اس کی اطاعت کیسے کی جائے۔ اس کے لیے اس نے خود ہی بتا دیا کہ میں نے اپنی کتاب تمہاری طرف نازل کر دی ہے۔ اس کتاب کی اطاعت یا محکومیّت، میری اطاعت یا محکومیّت ہوگی۔ اس کی تفصیل مطالب الفرقان جلد سوم صفحہ ۹ زیرِ آیت (۶/۱۱۴) گذر چکی ہے

اگر اسلام بھی باقی مذاہب کی طرح ایک مذہب ہوتا، تو ہر شخص اپنے اپنے طور پر کتاب اللہ کے احکام کی اطاعت کر لیتا۔ اسلام تو ایک اجتماعی نظام کا نام ہے دیکھئے مطالب الفرقان جلد دوم صفحہ ۲۱۳۔ زیر آیت (۲/۴۳) اس لیئے کتاب اللہ کی اطاعت، اجتماعی نظام کی رُو سے کی جا سکتی ہے اسے اسلامی نظام یا اسلامی مملکت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ لہٰذا خدا کی اطاعت کی عملی شکل اس مملکت یا حکومت کی اطاعت ہو گی جو قرآن مجید کے احکام و اصول و اقدار کے نافذ کرنے کے لیے قائم کی جائے۔

اس قسم کی پہلی حکومت، حضور نبی اکرمؐ نے قائم فرمائی تھی، اور خود حضورؐ اس مملکت کی سنٹرل اتھارٹی تھے۔ اس بنا پر اس مرکزی اتھارٹی (رسولؐ) کی اطاعت درحقیقت کتاب اللہ کی اطاعت یا، بالفاظ دیگر خدا کی اطاعت تھی۔ اس کے لیئے قرآن کریم نے "اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت" کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ اس سے مُراد ہے اس نظامِ خداوندی کی اطاعت، جسے سب سے پہلے رسول اللہؐ نے قائم فرمایا۔ چونکہ اطاعت خداوندی کے اس نظام کو حضورؐ کے بعد بھی قائم رہنا تھا۔ اس لیئے اللہ اور رسولؐ کی اطاعت کا عملی مفہوم اس نظام کی اطاعت تھا۔ اس نظام کی سنٹرل اتھارٹی کو "مرکزِ ملّت" کہہ کر پکارا جاتا ہے۔

"اللہ اور رسولؐ" کی اطاعت

یہ حقیقت کہ اللہ اور رسولؐ سے مرکزِ ملّت (یا نظامِ خداوندی یا اسلامی مملکت کا اقتدارِ اعلیٰ) مراد ہے، قرآن کریم میں ایسے واضح الفاظ میں اور اس شرح و بسط سے بیان ہوئی ہے کہ ان مقامات کو بغور دیکھ لینے کے بعد اس میں کسی شُبہ کی گنجائش نہیں رہتی اس کے لیئے قرآن مجید سے بیشتر شہادتیں پیش کی جا سکتی ہیں لیکن یہاں چند ایک مثالوں پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ مثلاً جنگِ اُحد میں جب مسلمانوں کی فوج میں خلفشار پیدا ہو گیا۔ اور حضورؐ تنہا رہ گئے تو آپؐ نے ان بکھرے ہوئے پروانوں کو آواز دی۔ اس آواز پر وہ سب پروانے پھر جمع ہو گئے۔ ظاہر ہے کہ یہ آواز نبی کریمؐ نے دی تھی۔ لیکن چونکہ حضورؐ کا یہ بلاوا حضورؐ کا ذاتی بلاوا نہ تھا بلکہ آپ نے بحیثیت سربراہِ مملکت یہ آواز دی تھی۔ اس لیئے اس آواز کو خدا اور رسول کی آواز قرار دے دیا گیا۔

اَلَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ مِنْۢ بَعْدِ مَآ اَصَابَهُمُ الْقَرْحُ ۛ لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا مِنْهُمْ وَاتَّقَوْا اَجْرٌ عَظِيْمٌ ۝ (۳/۱۷۲)

جن لوگوں نے اللہ اور اس کے رسولؐ کی پکار کا جواب دیا (اور جنگ کے لیئے تیار ہو گئے) باوجودیکہ (اس سے ذرا ہی پہلے وہ) زخم کھا چکے تھے۔ سو یاد رکھو، ان میں جو لوگ نیک کردار اور متّقی ہیں، یقیناً ان کے لیئے (اللہ کے حضور) بہت بڑا اجر ہے۔

۳۔ یہودیوں نے مدینہ میں اس عہد کو توڑا تھا جو انہوں نے نبی اکرمؐ سے استوار کیا تھا۔ اس عہد

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اللہ اور اُسکے رسُول کی اطاعت

سے کیا مُراد ہے؟

محترم پرویز صاحب

اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت قرآن مجید کا ایک اہم موضوع ہے۔ اس موضوع کی وضاحت سورۃ النساء کی آیت ۵۹ سے ہوتی ہے۔ یہ آیت وہ ہے جو:-

"نظامِ خداوندی (یا اسلامی مملکت) کا عُروۃ الوُثقیٰ ہے اور جس کا غلط مفہوم اُمت کی تمام اختلافات انگیزیوں اور تفرقہ بازیوں کا موجب ہے اور وہ آیت یہ ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنكُمْ ۖ فَإِن تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ إِن كُنتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ۚ ذَٰلِكَ خَيْرٌ وَأَحْسَنُ تَأْوِيلًا ﴿٥٩﴾

اس آیت کا مروّجہ ترجمہ اور صحیح مفہوم بعد میں پیش کیا جائے گا پہلے اِس پس منظر کو دیکھیے جس میں اس آیت نے بنیادی اہمیت حاصل کر رکھی ہے۔

اس وقت تک قرآن کریم کا جتنا حصّہ آپ کے سامنے آچکا ہے، اس سے آپ نے اس حقیقت کو تو سمجھ لیا ہوگا کہ اس کی بنیادی تعلیم یہ ہے کہ حکومت یا اطاعت صرف خدا کی ہے۔ اُس کے سوا کسی کی نہیں۔ یہی الدّین کی لِم ہے۔ یہی الاسلام کی غایت ہے۔ یہی توحید ہے۔ یہی خدا پر ایمان کا مقصدِ اوّلین ہے۔

قرآن کا سیاسی نظام

لیکن خدا کی ذات تو ایسی ہے کہ اس کا محسوس اور مرئی طور پر ہمارے سامنے آنا تو ایک طرف وہ ہمارے قیاس وخیال، گمان ووہم سے بھی ماورا رہے۔ اس سے سوال پیدا یہ ہوتا ہے کہ اس کی اطاعت کیسے کی جائے۔ اس کے لیے اس نے خود ہی بتا دیا کہ میں نے اپنی کتاب تمہاری طرف نازل کر دی ہے۔ اس کتاب کی اطاعت یا محکومیّت، میری اطاعت یا محکومیّت ہوگی۔ اس کی تفصیل مطالب الفرقان جلد سوم صفحہ ۹ زیر آیت (۲/۱۱۳) گذر چکی ہے

اگر اسلام بھی باقی مذاہب کی طرح ایک مذہب ہوتا، تو ہر شخص اپنے اپنے طور پر کتاب اللہ کے احکام کی اطاعت کر لیتا۔ اسلام تو ایک اجتماعی نظام کا نام ہے دیکھئے مطالب الفرقان جلد دوم صفحہ ۲۱۳۔ زیر آیت (۲/۴۳) اس لیئے کتاب اللہ کی اطاعت، اجتماعی نظام کی رُو سے کی جا سکتی ہے۔ اسے اسلامی نظام یا اسلامی مملکت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ لہٰذا خدا کی اطاعت کی عملی شکل اس مملکت یا حکومت کی اطاعت ہو گی جو قرآن مجید کے احکام و اصول و اقدار کے نافذ کرنے کے لیے قائم کی جائے۔

اس قسم کی پہلی حکومت، حضور نبی اکرمؐ نے، قائم فرمائی تھی، اور خود حضورؐ اس مملکت کی سنٹرل اتھارٹی تھے۔ اس بنا پر اس مرکزی اتھارٹی (رسولؐ) کی اطاعت درحقیقت کتاب اللہ کی اطاعت یا، بالفاظ دیگر خدا کی اطاعت تھی۔ اس کے لیئے قرآن کریم نے "اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت" کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ اس سے مُراد ہے اس نظامِ خداوندی کی اطاعت، جسے سب سے پہلے رسول اللہؐ نے قائم فرمایا۔ چونکہ اطاعتِ خداوندی کے اس نظام کو حضورؐ کے بعد بھی قائم رہنا تھا۔ اس لیئے اللہ اور رسولؐ کی اطاعت کا عملی مفہوم اس نظام کی اطاعت تھا۔ اس نظام کی سنٹرل اتھارٹی کو "مرکزِ ملّت" کہہ کر پکارا جاتا ہے۔

"اللہ اور رسولؐ" کی اطاعت

یہ حقیقت کہ اللہ اور رسولؐ سے مرکزِ ملّت (یا نظامِ خداوندی یا اسلامی مملکت کا اقتدارِ اعلیٰ) مراد ہے، قرآن کریم میں ایسے واضح الفاظ میں اور اس شرح و بسط سے بیان ہوئی ہے کہ ان مقامات کو بغور دیکھ لینے کے بعد اس میں کسی شُبہ کی گنجائش نہیں رہتی اس کے لیئے قرآن مجید سے بیشتر شہادتیں پیش کی جا سکتی ہیں لیکن یہاں چند ایک مثالوں پر اکتفاء کیا جاتا ہے۔ مثلاً جنگِ اُحد میں جب مسلمانوں کی فوج میں خلفشار پیدا ہو گیا۔ اور حضورؐ تنہا رہ گئے تو آپؐ نے ان بکھرے ہوئے پروانوں کو آواز دی۔ اس آواز پر وہ سب پروانے پھر جمع ہو گئے۔ ظاہر ہے کہ یہ آواز نبی کریمؐ نے دی تھی۔ لیکن چونکہ حضورؐ کا یہ بلاوا حضورؐ کا ذاتی بلاوا نہ تھا بلکہ آپ نے بحیثیت سربراہ مملکت یہ آواز دی تھی۔ اس لیئے اس آواز کو خدا اور رسول کی آواز قرار دے دیا گیا۔

اَلَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ مِنْۢ بَعْدِ مَآ اَصَابَهُمُ الْقَرْحُ ۛ لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا مِنْهُمْ وَاتَّقَوْا اَجْرٌ عَظِيْمٌ ۝ (۳/۱۷۲)

جن لوگوں نے اللہ اور اس کے رسولؐ کی پکار کا جواب دیا (اور جنگ کے لیئے تیار ہو گئے) باوجودیکہ (اس سے ذرا ہی پہلے وہ) زخم کھا چکے تھے۔ سو یاد رکھو، ان میں جو لوگ نیک کردار اور متقی ہیں، یقیناً ان کے لیے (اللہ کے حضور) بہت بڑا اجر ہے۔

۲۔ یہودیوں نے مدینہ میں اُس عہد کو توڑا تھا جو انہوں نے نبی اکرمؐ سے استوار کیا تھا۔ اس عہد

شکنی کو "خدا اور رسول" کی مخالفت کہہ کر پکارا گیا ہے، اس لیئے کہ یہ نظامِ اسلامی کی مخالفت تھی۔

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ شَآقُّوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ۚ وَمَنْ يُّشَآقِّ اللّٰهَ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ○ (۵۹/۴)

"یہ اس لیئے کہ کہ انہوں نے اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کی ہے، اور جو کوئی اللہ (کے حکم) کی مخالفت کرتا ہے تو (یاد رکھو) اللہ کا قانون (باداشِ عمل میں) سخت سزا دینے والا ہے۔"

۳۔ نظامِ اسلامی کے خلاف بغاوت کر کے فتنہ و فساد برپا کرنے والوں کے متعلق فرمایا کہ وہ خدا اور رسولؐ کے خلاف اعلانِ جنگ کرتے ہیں:

اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِيْنَ يُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَسْعَوْنَ فِى الْاَرْضِ فَسَادًا اَنْ يُّقَتَّلُوْٓا اَوْ يُصَلَّبُوْٓا اَوْ تُقَطَّعَ اَيْدِيْهِمْ وَاَرْجُلُهُمْ مِّنْ خِلَافٍ اَوْ يُنْفَوْا مِنَ الْاَرْضِ ۭ ذٰلِكَ لَهُمْ خِزْيٌ فِى الدُّنْيَا وَلَهُمْ فِى الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۙ○ (۵/۳۳)

"بلاشبہ اُن لوگوں کی جو" اللہ اور اس کے رسولؐ کے ساتھ جنگ کرتے ہیں[1]، اور ملک میں خرابی پھیلانے کے لیئے دوڑتے پھرتے ہیں۔ یہی سزا ہے کہ قتل کر دیئے جائیں یا سُولی پر چڑھا دیئے جائیں، یا اُن کے ہاتھ پاؤں مخالف سمتوں سے کاٹ ڈالے جائیں، یا انہیں جلاوطن کر دیا جائے (یعنی جیسی کچھ سزا اُن کے لیئے ضروری ہو، انہیں دی جائے) یہ اُن کے لیئے دُنیا میں رُسوائی ہے اور آخرت میں بھی اُن کے لیئے عذابِ عظیم ہے۔"

۴۔ یہاں تو "اللہ اور رسولؐ" کے خلاف جنگ کرنے کا ذکر ہے۔ سُورۃ احزاب میں ہے

اِنَّ الَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ فِى الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَاَعَدَّ لَهُمْ عَذَابًا مُّهِيْنًا ○ (۳۳/۵۷)

جو لوگ اللہ اور اس کے رسولؐ کو اذیت پہنچاتے ہیں، ان کے لیئے دنیا اور آخرت میں ذلت

---

[1] سید ابوالاعلیٰ مودودی (مرحوم) اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے کہتے ہیں: "زمین سے مُراد یہاں وہ ملک یا علاقہ ہے جس میں امن و انتظام قائم کرنے کی ذمہ داری اسلامی حکومت نے لے رکھی ہو۔ اور خدا و رسول سے لڑنے کا مطلب اس نظامِ صالح کے خلاف جنگ کرنا ہے جو اسلام کی حکومت نے ملک میں قائم رکھا ہو"۔ (تفہیم القرآن۔ جلد اوّل۔ صفحہ ۴۶۵۔ ایڈیشن ۱۹۵۱ء)

آمیز عذاب ہے، اور خدا کی لعنت ہے۔"

اس آیت میں اگر اللہ سے مراد اللہ تعالیٰ اور رسول سے مراد رسول اللہؐ کی ذات لی جائے تو اس سے بڑی پیچیدگی پیدا ہو جاتی ہے۔ رسول اللہ کو اذیت پہنچانے کی بات تو سمجھ میں آ سکتی ہے، کیونکہ آپ ایک انسان تھے، اور ایک انسان (یا انسانوں کا گروہ) دوسرے انسان کو اذیت پہنچا سکتا ہے۔ (رسول اللہؐ کو اذیت پہنچانے کا ذکر قرآن مجید کے کئی ایک مقامات میں آیا ہے) لیکن اللہ کو اذیت پہنچانے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اسے کون اذیت پہنچا سکتا ہے؟ اس لیے اس آیت میں "اللہ اور اس کے رسولؐ" کو اذیت پہنچانے سے مقصد نظامِ خداوندی کو نقصان پہنچانا ہے۔

۵۔ اب آگے چلیے۔ جب نظامِ حکومت کے قیام کے بعد، سب سے پہلا اجتماع عظیم (حج اکبر) ہوا، تو اس میں اس حکومت کی طرف سے کچھ عام اعلانات کیے گئے جن میں بتایا گیا کہ اس حکومت کی پالیسی اور امورِ خارجہ میں مسلک کیا ہوگا۔ اس ضمن میں جو سب سے پہلا اعلان کیا گیا اس کے الفاظ یہ تھے:

بَرَآءَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖٓ اِلَى الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝ (۹/۱)

"(اے پیروانِ دعوتِ ایمانی!) جن مشرکوں کے ساتھ تم نے (صلح و امن کا) معاہدہ کیا تھا، اب ان کے لیے اللہ اور اس کے رسولؐ کی طرف سے بری الذمہ ہونے کا اعلان ہے۔"

پھر تیسری آیت میں ہے:

وَاَذَانٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖٓ اِلَى النَّاسِ يَوْمَ الْحَجِّ الْاَكْبَرِ اَنَّ اللّٰهَ بَرِيْٓءٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۙ وَرَسُوْلُهٗ ۭ فَاِنْ تُبْتُمْ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِي اللّٰهِ ۭ وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝ (۹/۳)

"اور اللہ اور اس کے رسولؐ کی طرف سے حج کے بڑے دن عام منادی کی جاتی ہے کہ اللہ مشرکوں سے بری الذمہ ہے اور اس کا رسولؐ بھی (یعنی ان میں اور نظامِ خداوندی میں اب کوئی معاہدہ باقی نہیں رہا) پس اگر تم (اب بھی ظلم و شرارت سے) باز آ جاؤ تو تمہارے لیے اس میں بہتری ہے اور اگر نہ مانو تو جان رکھو تم نظامِ حکومتِ خداوندی کو عاجز نہیں کر سکتے، اور (اے پیغمبر اسلامؐ!) جو لوگ کفر کی راہ پر چل رہے ہیں، انہیں عذابِ دردناک کی خوشخبری سنا دو۔"

پھر ساتویں آیت میں ہے:۔

كَيْفَ يَكُونُ لِلْمُشْرِكِينَ عَهْدٌ عِندَ اللَّهِ وَعِندَ رَسُولِهِ إِلَّا الَّذِينَ عَاهَدتُّمْ عِندَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۖ فَمَا اسْتَقَامُوا لَكُمْ فَاسْتَقِيمُوا لَهُمْ ۖ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِينَ ○ (۹/۷)

"یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ (ان) مشرکوں کا عہد اللہ اور اس کے رسولؐ کے نزدیک عہد ہو گا یا جن لوگوں کے ساتھ تم نے مسجد حرام کے قریب (حدیبیہ میں) عہد و پیمان باندھا تھا (اور انہوں نے اسے نہیں توڑا، تو ان کا عہد ضرور عہد ہے، اور) جب تک وہ تمہارے ساتھ (اپنے عہد پر) قائم رہیں تم بھی اُن کے ساتھ اپنے عہد پر قائم رہو۔ اللہ انہیں دوست رکھتا ہے جو (اپنے تمام کاموں میں) متقی ہوتے ہیں"۔

اللہ اور رسولؐ سے مراد مرکزِ نظامِ اسلامی ہے

غور کیجیے۔ یہ تمام معاہدات اسلامی حکومت کے ساتھ تھے، اور اسی حکومت کے نمائندہ کی طرف سے یہ اعلانات ہو رہے تھے۔ لیکن انہیں اللہ اور رسولؐ کے منشورات کہا گیا ہے۔ اس بیان حقیقت سے مقصود یہ ہے کہ لوگوں کی توجہات کو اس نکتہ مرکز کی طرف مرکوز کیا جائے کہ اگرچہ یہ تمام احکام رسولؐ کی طرف سے صادر ہو رہے ہیں۔ لیکن درحقیقت یہ اللہ کے احکام ہیں۔ اس لیے کہ یہ نظامِ حکومتِ خداوندی کے مرکز کی طرف سے نافذ ہو رہے ہیں اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں دین کے غلبہ و تمکّن اور حزب اللہ کی کامیابی و ظفرمندی کے متعلق متعدد مقامات پر وعدے کیے ہیں۔ اس غلبہ اور کامیابی کے متعلق فرمایا کہ یہ اللہ اور رسولؐ کی کامیابی ہے۔

كَتَبَ اللَّهُ لَأَغْلِبَنَّ أَنَا وَرُسُلِي ۚ إِنَّ اللَّهَ قَوِيٌّ عَزِيزٌ ○ (۵۸/۲۱)

"اللہ نے لکھ دیا ہے کہ میں اور میرا رسولؐ ہی غالب رہیں گے۔ بلاشبہ اللہ قوت و غلبہ والا ہے"۔

ظاہر ہے کہ یہ غلبہ اور تسلّط اسلامی حکومت ہی کا تمکّن و تسلّط تھا، ورنہ اللہ تو ہر جگہ غالب ہے لہٰذا اللہ اور رسولؐ کے غلبہ سے مراد نظامِ اسلامی کے غلبہ ہی سے ہے۔ جب مسلمانوں کی مملکت قائم ہو گئی (جسے حکومتِ خداوندی یا اسلامی نظام کہا جاتا ہے) تو ظاہر ہے کہ اس حکومت کی جو آمدنی ہوتی تھی وہ مملکت کی آمدنی تھی، اسے بھی قرآن کریم نے "خدا اور رسولؐ" کی دولت کہہ کر پکارا ہے۔ (۵۹/۷)۔ مالِ غنیمت کی تقسیم کے سلسلہ میں کہا کہ خُمس (پانچواں حصّہ) "اللہ اور رسولؐ" کے لیے الگ کر لو۔ (۸/۴۱) ظاہر ہے کہ اس سے مراد یہی ہے کہ یہ پانچواں حصّہ، امورِ مملکت کی سرانجام دہی کے لیے صَرف کیا جائے گا۔

یہ حقیقت کہ ان مقامات میں اللہ اور رسول سے مراد نظامِ خداوندی یا اسلامی حکومت ہے، میری اختراع نہیں۔ متقدّمین اور متاخرین کے ممتاز مفسرین نے بھی اس سے یہی مُراد لی ہے۔ میں ان کے اقتباسات درج کرنا ضروری نہیں سمجھتا۔ میں اس موضوع پر بڑی کثرت سے لکھتا چلا آرہا ہوں بالخصوص "اسلامی نظام" اور "اسلام میں قانون سازی کا اصول" نامی کتابچہ میں۔ طلوعِ اسلام بابت دسمبر ۱۹۷۹ء میں، علّامہ اسلم جیراجپوری کے محققانہ مقالہ "اسلامی نظام" میں بھی متقدّمین کے بہت سے حوالے دیئے گئے ہیں[1]۔

⊙

ان تشریحات کی روشنی میں، آیت زیرِ نظر ($\frac{4}{59}$) کی طرف آیئے۔ بات آسانی سے سمجھ میں آجائے گی۔ اس سے پہلی آیت ($\frac{4}{58}$) میں بات نظامِ حکومت کی ہو رہی تھی۔ اس آیت میں اس نظام کے عملی پہلو کو سامنے لایا گیا ہے۔ کوئی حکومت بھی ہو، اس میں ایک تو اس کی مرکزی اتھارٹی (سنٹرل گورنمنٹ) ہوتی ہے۔ اور دوسرے اس کے افسرانِ ماتحت (عمّالِ حکومت)۔ آیت میں کہا یہ گیا ہے کہ "یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ ج"۔

اُولِی الْاَمْرِ سے مُراد

یعنی اس نظام کی مرکزی اتھارٹی کی بھی اطاعت کرو، اور اس کے افسرانِ ماتحت کی بھی۔ اس کے بعد ہے: "فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْہُ اِلَی اللّٰہِ وَالرَّسُوْلِ ۔" اگر تم میں اور ان افسرانِ ماتحت میں اختلاف ہو جائے تو اس معاملہ کے تصفیہ کے لیے مرکزی حکومت کی طرف رجوع کرو"۔ پوری آیت کا مفہوم حسبِ ذیل ہو گا۔

"نیز یہ بھی ضروری ہے کہ تم اس نظام کی پوری پوری اطاعت کرو جسے قوانینِ خداوندی کو نافذ کرنے کے لیے، رسول نے قائم کیا ہے۔ اور اس نظام کے مرکز کے مقرّر کردہ نمائندگانِ حکومت (افسرانِ ماتحت) کی بھی اطاعت کرو۔ پھر اگر ایسا ہو کہ تم میں اور ان افسرانِ ماتحت میں، کسی بات میں اختلاف ہو جائے، تو اس کے لیے مرکز کی طرف رجوع کرو ——— یعنی افسرانِ ماتحت کے خلاف مرکزی اتھارٹی سے اپیل کرو، جو اس تنازعہ کا قوانینِ خداوندی کے مطابق فیصلہ کر دے گی۔" ($\frac{4}{10}$، $\frac{5}{48}$)

مرکزی اتھارٹی کے خلاف کہیں اپیل نہیں ہو سکتی۔ اس کا فیصلہ، آخری ہو گا۔ اور چونکہ

---

[1] علّامہ اسلم جیراجپوری کا یہ مضمون بھی آئندہ اشاعت میں شائع کیا جائے گا۔

وہ فیصلہ قانونِ خداوندی کے مطابق ہوگا، جس پر تم ایمان رکھتے ہو اس لیے اس فیصلہ کو بطیب خاطر تسلیم کرو۔ اس کے خلاف دل میں بھی کوئی گرانی محسوس نہ کرو۔ (۴/۶۵) یہ شہادت ہوگی اس بات کی کہ تم واقعی خدا کے ضابطۂ ہدایت، اور قانونِ مکافاتِ عمل اور حیاتِ اُخروی پر یقین رکھتے ہو۔ یہ روش نہایت عمدہ، اور انجام کار معاشرہ کا صحیح صحیح توازن قائم رکھنے کا موجب ہوگی۔"

بعد میں کیا ہوا؟

جب تک اسلامی نظامِ حکومت قائم رہا، اس آیت کا یہی مفہوم لیا جاتا رہا۔ حضورؐ نے جو فرمایا تھا کہ "تم پر میری اور میرے خلفائے راشدینؓ کی سنّت کا اتّباع لازمی ہے"، تو اس سے یہی مُراد تھی۔ خلفائے راشدینؓ کی کوئی تعداد مقرر نہیں تھی۔ جب تک اسلامی نظام قائم رہا، اس کے سربراہ خلفائے راشدینؓ کے لقب سے سرفراز ہے۔ یہ سوءِ اتفاق ہے (اور اُمّت کی حرماں نصیبی) کہ یہ سلسلہ معدودے چند سال تک قائم رہا۔ بعد میں جب یہ نظام، ملوکیت میں بدل گیا تو اس آیت کے مفہوم میں دُشواری پیش آگئی۔ نظامِ ملوکیت میں اُمّت میں ثنویّت پیدا ہوگئی۔ دنیاوی امور حکومت کی تحویل میں آگئے۔ اور امورِ شریعت علماء کی تحویل میں۔ اس ثنویّت کی رُو سے اس آیت کے معنی یہ کیے گئے کہ تم اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو اس کے رسولؐ کی اور اربابِ حکومت (اُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ) کی۔ اگر تم میں اور حکومت میں کسی بات میں اختلاف ہو جائے تو اُس اختلاف کے رفع کرنے کے لیے حضراتِ علماء کرام کی طرف رجوع کرو تاکہ وہ بتائیں کہ اس باب میں اللہ اور اس کے رسولؐ کا کیا حکم ہے۔ علماء کا فیصلہ تمہارے (عوام) اور حکومت دونوں کے لیے قولِ فیصل ہوگا۔

تھیاکریسی

بادنیٰ تدبّر یہ حقیقت سمجھ میں آجائے گی کہ اس سے آخری اقتدار، مذہبی پیشوائیت کے ہاتھ میں آگیا۔ اور چونکہ وہ اپنے فیصلے کو "اپنا فیصلہ" قرار نہیں دیتے تھے بلکہ اسے "خدا اور رسولؐ کا فیصلہ"، کہہ کر صادر کرتے تھے، اس لیے کسی کی مجال نہیں تھی کہ اس سے سرتابی کر سکے۔ عوام کا بے پناہ ہجوم (خدا اور رسولؐ کے نام پر مٹنے کے لیے) اُن کے ساتھ ہوتا تھا۔ اس سے ایسی تھیاکریسی وجود میں آگئی جس کی مثال کہیں نہیں ملتی۔ چنانچہ ہماری تاریخ اس پر شاہد ہے کہ ان حضرات (مذہبی پیشوائیت) نے کسی حکومت کو بھی چین سے نہیں بیٹھنے دیا۔ جب تک حکومت ان کے ساتھ سازباز رکھتی، یہ اس کے ہر فیصلے کو خدا اور رسولؐ کا فیصلہ قرار دیتے۔ جونہی اس سے کوئی اختلاف ہوتا، یہ خدا اور رسولؐ کے نام پر عوام کو اس کے خلاف اُٹھ کھڑا کرتے۔ یہی کچھ آج تک ہو رہا ہے۔" (مطالب الفرقان، جلد چہارم صـ ۳۳۹ تا ۳۴۳)

حقائق و عبر

۱۔ جماعت اسلامی کا اپنی غلطیوں سے اغماض

ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے ماہنامہ میثاق کی اپریل ۱۹۸۸ء کی اشاعت کے اداریے (عرض احوال) میں جماعت اسلامی کی سنگین غلطیوں کی نشاندہی کی گئی ہے، پھر آخر میں مندرجہ ذیل الفاظ میں اس امر پر افسوس کا اظہار کیا گیا ہے کہ کس طرح جماعت اسلامی والے اپنی ان سنگین غلطیوں سے چشم پوشی کر رہے ہیں:۔

"لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ جماعت میں اپنی غلطیوں سے اغماض عادتِ ثانیہ ان پر اصرار حکمتِ بالغہ اور ان کی پُرپیچ تاویلات ادبِ عالیہ بنتا جا رہا ہے۔ حال ہی میں قیادت میں نمایاں تبدیلی کے بعد تو اس عمل میں برق کی سی تیزی آئی نظر آ رہی ہے۔ کراچی میں شکست کے تجربے سے اس نے اگر کوئی سبق سیکھا تو یہ کہ اسے اور زیادہ "عوامی" ہو جانا چاہیے۔ "کاروان دعوت و محبت" کا خوبصورت لیبل لگا کر جماعت نے اپنی افرادی قوت، مالی وسائل اور شان و شوکت کے مظاہرے کا جو سلسلہ شروع کیا ہے اس میں دعوت اور محبت نام کی چیزیں تو عنقا ہیں۔ دوسرے سیاسی گروہ اور جماعت اسلامی کی حریف دینی جماعتوں کے ہاتھ ایک تو شغل ضرور لگ جائے گا۔ پھر دیکھئے اس طوفان ہاؤ ہو اور غوغا آرائی میں کس کا نمبر پہلا رہتا ہے۔ رہے عوام تو انہیں بغیر ٹکٹ تماشے دیکھنے کو ملیں گے۔ وہ تماشوں کے عادی ہو چکے ہیں اور بڑے شوق سے منتظر رہیں گے کہ نیا تماشا کدھر سے اور کب دیکھنے کو ملتا ہے۔"

(ماہنامہ میثاق بابت اپریل ۱۹۸۸ء صفحہ ۹)

ڈاکٹر اسرار احمد صاحب اور میثاق کے اداریہ نویس کسی زمانے میں جماعت اسلامی کے سرکردہ لیڈر رہے ہیں، اس لئے جماعت کے گھر کے احوال ان سے زیادہ کون جانتا ہوگا!

۲۔ ملّتِ جعفریہ اور شیعہ قوم... یعنی چہ؟

خاتم النبیین حضور نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کی اُمّت کے متعلق ارشادِ ربانی ہے کہ:۔

هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ ...... (۲۲/۷۸)

"اس نے تمہارا نام مسلم رکھا ہے"

آپؐ نے اپنی لسانِ مبارک سے فرمایا:

اَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ ٥ (۶/۱۴، ۶/۱۶۴، ۲۷/۹۱، ۳۹/۱۲، ۴۰/۶۶)

"میں سب سے پہلا مسلم ہوں"

آپؐ سے ارشادِ باری تعالیٰ ہے کہ آپؐ نے ملّتِ ابراہیمیؑ کا اتباع کرنا ہے۔

ثُمَّ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ اَنِ اتَّبِعْ مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ..... (۱۶/۱۲۳)

"پھر ہم نے آپ کے پاس وحی بھیجی کہ آپ ہر طرف سے صرفِ نظر کر کے خالص مسلکِ ابراہیمیؑ کا اتباع کریں"

اور قُلْ اِنَّنِيْ هَدٰىنِيْ رَبِّيْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ دِيْنًا قِيَمًا مِّلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ...... (۶/۱۶۱)

"ان سے کہہ دیجئے کہ میرے رب نے میری رہنمائی، زندگی کی سیدھی اور متوازن راہ کی طرف کر دی ہے، یعنی ایک ایسے نظامِ زندگی کی طرف جو (خود بھی اپنے زورِ دروں پر قائم ہے اور) انسانیت کے قیام کا بھی باعث ہے۔ یہ وہی نظامِ زندگی ہے جسے ابراہیمؑ نے، ہر طرف سے مُنہ موڑ کر اختیار کیا تھا"

ملّتِ ابراہیمیؑ کے موسسِ اولیٰ، حضرت ابراہیمؑ کے لبوں پر تعمیر کعبہ کے وقت، یہ حسین دعائیں تھیں کہ:

رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ ٥ (۲/۱۲۸)

"اے ہمارے رب ہمیں اپنا سچا مسلم بنا اور ہماری اولاد میں سے بھی اپنے لئے اُمّتِ مسلمہ بنا"

قارئین کرام ملاحظہ فرمائیں کہ حضور نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کو اتباعِ ملّتِ ابراہیم کا حکم دیا گیا اور حضرت ابراہیمؑ اپنے رب سے یہ دعائیں مانگتے ہیں کہ ہمیں اپنے سچے مسلم بنا اور ہماری اولاد میں سے اُمّتِ مسلمہ پیدا کر۔ حضور نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم، اتباعِ ملّتِ ابراہیمیؑ میں اس کا اعلان فرماتے ہیں کہ

میں سب سے پہلا مسلم ہوں۔

آپ کی اُمّت، دنیا کے گوشہ میں اپنے آپ کو ملّتِ اسلامیہ کے نام سے متعارف کراتی اور مسلم قوم کے نام ہی سے جانی پہچانی جاتی ہے۔ حتیٰ کہ اس ملّت کو حکم یہ دیا گیا ہے کہ :-

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ۝ (۳/۱۰۲)

"اے ایمان والو اضابطۂ خداوندی کی نگہداشت کرو۔ جیسا کہ نگہداشت کرنے کا حق ہے (اور یہ نگہداشت محض ہنگامی اور وقتی طور پر نہ کرو، بلکہ اپنی ساری زندگی اس نہج پر گزارو) اور جب تمہیں موت آئے تو بجز اسلام کے اور کسی حالت پر جان نہ دینا"

یعنی تمہاری ساری زندگی اسی نہج پر گزرنی چاہیئے اور تمہیں موت بھی اسی حالت میں آنی چاہیئے مرتے دم تک مسلم رہنا اور

اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہمیشہ سامنے رکھنا کہ :-

فَهَلْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ۝ (۱۱/۱۴)

"تو کیا تم مسلم ہو؟"

اللہ جل شانہٗ نے صاف صاف الفاظ میں فرما دیا کہ اُس سے بہتر کون ہو سکتا ہے جو اپنے آپ کو مسلم کہے :-

وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَآ اِلَى اللّٰهِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَّقَالَ اِنَّنِيْ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ۝ (۴۱/۳۳)

اس شخص کی بات سے زیادہ حسین اور جاذب، بات کس کی ہو سکتی ہے جو لوگوں کو اللہ (کے قانون) کی طرف دعوت دیتا ہے اور خدا کے متعین کردہ صلاحیت بخش پروگرام پر عمل پیرا ہوتا ہے اور کہتا ہے کہ میں مسلمین میں سے ہوں یعنی ان لوگوں میں سے ہوں جو قوانینِ ربّانی کے اطاعت گزار ہیں۔

یعنی ہر جگہ، ہر حال میں نام مسلم اور ملّت ابراہیمیؑ

ان قرآنی تصریحات کے بعد، ذیل کا بیان ملاحظہ فرمائیے جو روزنامہ جنگ لاہور کی مورخہ ۲۱ مئی ۱۹۸۸ء کی اشاعت میں شائع ہوا ہے۔

منگل کے روز نماز عید پڑھانے والے شیعہ علماء نے ملت جعفریہ کے وقار اور یکجہتی کو مجروح کرنے کی سازش کی ہے۔

"لاہور (نمائندہ جنگ) مرکزی پاکستان شیعہ فیڈریشن کے سیکرٹری جنرل الحاج حیدر علی مرزا اور آل پارٹیز شیعہ فیڈریشن کے کنوینر خلیفہ نذیر حسین نے اپنے بیانات میں کہا ہے کہ منگل کے روز

نماز عید پڑھانے والے شیعہ علماء نے ملت جعفریہ کے وقار اور یکجہتی کو مجروح کرنے کی گہری سازش کی ہے جس کی تمام ملت جعفریہ مذمت کرتی ہے انہوں نے کہا کہ مرکزی رویت ہلال کمیٹی نے بروقت اور شیعہ علمائے حق نے مکمل اطمینان حاصل کرنے کے بعد بدھ کے روز عید منانے کا فیصلہ کر کے اپنی شرعی ذمہ داری کا عملی ثبوت فراہم کیا ہے انہوں نے کہا کہ کتنی افسوس کی بات ہے کہ منگل کے روز عید پڑھانے والے مولویوں نے بدھ کو بھی عید کی نماز پڑھا کر اپنے ضعیف العقیدہ ہونے کا عملی مظاہر کیا ہے علی محمد خواجہ نے بھی کہا ہے کہ نماز عید کو خراب کرنے والے عناصر شیعہ قوم کے بہی خواہ نہیں ہیں"

اس بیان میں ملتِ جعفریہ اور شیعہ قوم کی ترکیبات پر غور فرمایئے!

کیا ہم یہ سوال پوچھنے میں حق بجانب ہیں کہ اللہ اور اس کے رسولؐ کے متذکرہ واضح ارشادات کے بعد آپ نے آپ کو ملت مسلمہ کے علاوہ کسی اور نام سے متعارف کرانا، اللہ کے اور رسول کے کن احکام کا اتباع ہے؟ ہمارا یہی سوال ہر اُس شخص یا فرقہ سے بھی ہے جس نے اپنا نام 'مسلم' کے علاوہ کچھ اور رکھا ہوا ہے۔

۲۔ منہاج القرآن تحریک کا آغاز رسولِ خدا کے حکم سے؟

روزنامہ نوائے وقت لاہور کی ۹ جون ۱۹۸۸ء کی اشاعت کے صفحہ ۲ پر ادارہ منہاج القرآن کے بانی ڈاکٹر پروفیسر طاہر القادری صاحب کا یہ بیان شائع ہوا ہے کہ دین اسلام کی خدمت اور احیائے اسلام کے لئے منہاج القرآن کی تحریک کا آغاز انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے کیا ہے۔ ان کے اس قسم کے خیالات، اکثر اخبارات میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ اور وہ عوام کو تاثر دیتے رہتے ہیں کہ وہ سب کام رسول اللہ کے حکم سے کرتے ہیں۔

حال ہی میں انکی ایک کتاب "بلا سود بنکاری" شائع ہوئی ہے۔ جس کے صفحہ ۱۰۰ پر وہ بینکوں کے سود کو ان الفاظ میں جائز قرار دیتے ہیں:۔

اس موضوع پر لمبی چوڑی بحث کے بعد مولانا شاہ احمد رضا خان صاحب کا یہ قول نقل کرتے ہیں کہ اگر کوئی شخص دس روپے کا نوٹ دوسرے شخص کو سال بھر کے وعدے پر بارہ روپے میں بیچ دے تو جائز ہے۔ اس کی تائید میں انہوں نے مولانا ارشاد حسین رامپوری کا فتویٰ بھی نقل کیا ہے۔ آپ

فرماتے ہیں کہ خرید و فروخت نوٹ مذکور کی، زیادہ یا کم پر جائز ہے۔ اس واسطے کہ احکام نے اس کو مال قرار دیا ہے۔ اور آخر میں ردّ المختار کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ اگر ایک کاغذ ہزار روپے میں خریدا۔ تو یہ بھی بلا کراہت جائز ہے ۔"

(ربا۔ سود بنکاری از پروفیسر ڈاکٹر محمد طاہر القادری صاحب
شائع کردہ ادارہ منہاج القرآن، ۳۹۵۔ ایم۔ ماڈل ٹاؤن لاہور)

قرآن مجید کی رُو سے سود، اسلام میں سب سے بڑا حرام ہے اور یہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول یعنی اسلامی نظام سے جنگ کے مترادف ہے۔ کیا جناب طاہر القادری صاحب نے سود کو بھی رسولِ خدا کے حکم سے حلال کیا ہے؟ بینوا وتوجروا!

۴۔ تبصرہ۔ ہندوستان میں ہندو مسلم شادیاں

اسلام آباد پاکستان کے روزنامہ 'مرکز' میں شائع شدہ ایک رپورٹ کے مطابق ہندوستان کے وزیر عبد الغفور کی بیوی ہندو ہے اور اس کا نام کنول دیوی ہے۔ مسلمان وزیر کے تین بیٹے ہیں جو باقاعدگی سے مندر جاتے ہیں۔ بھارت کے سابق مسلمان صدر ڈاکٹر ذاکر حسین کی دو نواسیوں نے ہندو لڑکوں سے شادی کر لی۔ یہ دونوں لڑکیاں خورشید عالم خاں کی بیٹیاں ہیں۔ سابق نائب صدر ہدایت اللہ کی بیوی شکنتلا بھی ہندو ہے۔ حیدر آباد کے سابق وزیر اور مسلم لیڈر یونس سلیم کی بیٹی نے حال ہی میں ایک ہندو لڑکے سے شادی کی۔ اتر پردیش کے سابق رکنِ پارلیمنٹ اسد خان چوچڑا نے ایک ہندو لڑکی کو بیوی بنایا آسام کے وزیر بھرت نارہ نے ایک خوب صورت مسلمان لڑکی سے بیاہ کیا۔ اردو کے ممتاز ادیب رشید صدیقی نے خود ایک ہندو لڑکی کو بیوی بنایا۔ اور اپنی بیٹی کو ہندو ادیب کرشن چندر سے بیاہ دیا۔ اس کے علاوہ درجنوں ایسے فلمی اداکار ہیں جنہوں نے غیر مذہب لڑکیوں سے شادیاں رچائیں۔

(ہفت روزہ انصاف راولپنڈی بابت ۳۱ مئی ۱۹۸۶ء، آخری صفحہ)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نقد و نظر

1۔ نام کتاب : مظاہرِ فطرت اور قرآن
مصنف : ڈاکٹر سید عبدالودود
ضخامت : ۴۱۹ صفحات + ۴ عدد پلیٹیں
قیمت : ۱۳۲/- روپے
ناشر : خالد پبلشرز، ۵۰ عثمان بلاک نیو گارڈن ٹاؤن۔ لاہور ۵۴۶۰۲
طابع : النور پرنٹرز و پبلشرز، ۳ فیصل نگر ملتان روڈ۔ پوسٹ بکس ۴۱۹۰۔ لاہور ۲۵

ڈاکٹر سید عبدالودود صاحب، علمی حلقوں میں کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ وہ ایک ماہر سرجن ہیں اور "قرآن اور سائنس" اُن کا خاص موضوع ہے۔

انہوں نے دس برس تک، لاہور میں، محترم پرویز صاحب کے درسِ قرآن کے دورۂ اوّل (۱۹۵۸ء تا ۱۹۶۸ء) میں باقاعدگی سے شرکت کی (اس درس کے دوران ان کیلئے مخصوص نشست کا انتظام کیا جاتا تھا)۔ اور اس دوران ایک ایسے ڈاکٹر کی حیثیت سے جس کا تعلق علم الابدان سے ہے۔ انہوں نے جو نہایت گہری نظر سے قرآن کریم کا مطالعہ کیا، تو قرآن کریم میں تخلیق کائنات سے لے کر زندگی کی انسانی سطح تک انہیں ایسے عظیم حقائق نظر آئے جن میں سے ایک ایک کا عالم یہ تھا کہ "کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجا است"۔ چنانچہ انہوں نے ایک طرف قرآنی آیات پر غور و تدبّر شروع کیا اور دوسری طرف علوم سائنس کے متعلق اپنے مطالعہ کو وسیع سے وسیع تر کرتے چلے گئے۔ انہوں نے متقدمین سے لے کر متاخرین تک کے سائنسدانوں کی شہرہ آفاق اور قابلِ اعتماد تصانیف کو کھنگال ڈالا۔ ان میں جو نظریات، حقیقت کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں۔ انہیں قرآنی حقائق کی روشنی میں پرکھا اور اس طرح پہلے دس سال کے قرآنی مطالعہ اور بعد کے چار سال کی کوہکنی اور خارہ شگافی کے بعد جو جوئے شیر لانے میں وہ کامیاب ہوئے اسے انہوں نے ۱۹۷۱ء میں، دنیائے انسانیت کے سامنے (THE PHENOMENA OF NATURE AND THE QURAN) کے نام سے پیش کیا۔ اس وقت سے لیکر آج تک ان کی یہ علمی کاوش متعدد بین الاقوامی سطحوں پر خراجِ تحسین حاصل کر چکی ہے۔ (اس کتاب پر تبصرہ

محترم پرویز صاحب نے "قرآنی کوہکن کی جوئے شیر" کے عنوان سے خود سپردِ قلم کیا تھا۔ جو فروری ۱۹۷۲ء کے شمارہ طلوع اسلام میں شائع ہوا تھا۔

اس کے بعد ڈاکٹر صاحب موصوف نے اوائل ۱۹۷۷ء میں، قرآن کریم کے خلاف سازشوں کی پردہ کشائی کرتے ہوئے اپنی تحقیق کو (CONSPIRACIES AGAINST THE QURAN) کے نام سے پیش کیا جو اس موضوع پر بیش بہا معلومات کا خزانہ ہے۔ بعد ازیں انہوں نے (FOOD AND HYGIENE IN ISLAM) کے نام سے ایک کتابچہ شائع کیا جس کے مندرجات اس کے عنوان سے ظاہر ہیں۔

اس دوران میں وہ برابر علمی تحقیق کرتے رہے اور ۱۹۸۲ء میں اپنی دوسری علمی تحقیق (THE HEAVENS THE EARTH AND THE QURAN) کے نام سے پیش کی، جسے بجا طور پر پہلی کتاب کا مطلع ثانی کہا جا سکتا ہے۔ اس میں انہوں نے ارض و سموٰت کے حقائق کی وضاحت قرآن کریم کی روشنی میں کی ہے۔ اس کتاب نے بھی اپنی پیش رو تصنیف کی طرح ہر طرف سے دادِ تحسین حاصل کی۔

چونکہ یہ دونوں کتابیں انگریزی زبان میں تھیں اور انہوں نے اس قدر شہرت حاصل کی، اس سے اردو دان طبقہ میں ان سے استفادہ کرنے کی آرزوئیں شدید ہوتی گئیں۔ اور انہوں نے تقاضے کرنا شروع کر دیئے کہ ان دو عظیم سائنسی تحقیقات کو اردو میں بھی پیش کیا جائے۔ لیکن چونکہ سائنس کی اصطلاحات کے متبادل الفاظ اردو زبان میں بمشکل ہی مل سکتے ہیں، اس لیے جہاں ڈاکٹر صاحب اردو دان طبقہ کی مشکل سے پوری طرح متفق تھے۔ وہیں اردو زبان کی سائنس سے متعلق کوتاہ دامنی کی وجہ سے ان کے اس مطالبہ کی تعمیل سے ایک عرصہ اعراض کرتے رہے تاآنکہ ان کے یہ تقاضے ایسی شدت اختیار کر گئے جن میں انہوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ انگریزی زبان نہ جاننے کی اتنی بڑی سزا نہ ہونا چاہیئے کہ انہیں قرآن کریم کے ان عظیم حقائق سے آشنائی نہ ملے۔ آخر کار ڈاکٹر صاحب نے اس کوہ آسا مہم کو سر کرنا شروع کر دیا۔ اور ایسے ہمت شکن مراحل سے گذر کر، جن کا ذکر شاید قارئین کے لیے زیادہ دلچسپی کا باعث نہ بن سکے، وہ اپنی اس قرآنی جوئے شیر کو اردو کا پیرہن عطا کرنے میں کامیاب ہو ہی گئے۔

پہلی کتاب ۱۹۷۱ء میں لکھی گئی اور دوسری ۱۹۸۲ء میں۔ اس دوران سائنس نے مزید اتفاقی منزلیں طے کر کے اور بہت سے حقائق کو بے نقاب کر دیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنی اس نئی تصنیف "مظاہرِ فطرت اور قرآن" میں ان تمام حقائق کو بھی سمو دیا ہے۔ جو اس عرصہ میں سامنے آئے۔ چنانچہ ان کی یہ کتاب، پہلی کتابوں کا صرف اردو پیرہن ہی نہیں بلکہ اس میں گراں قدر اضافوں نے اسے ان دونوں کتابوں کا تازہ ترین اور بہتر ایڈیشن بنا دیا ہے۔

اس کتاب میں سائنس کے جن حقائق کو قرآن کریم کی روشنی میں موضوع بنایا گیا ہے، اور جو حسب ذیل ہیں۔ ان پر ایک نظر ڈالنے سے اس کتاب کا افادیت کا انداز لگ سکتا ہے:۔

اللہ کا قانونِ تخلیق ۔ کائنات کی کیمیائی اور طبعی بنیاد۔ کائنات کا ڈھانچہ ۔ تخلیق کائنات ۔ زمین کی ساخت ۔ ہوائیں بادل اور اولے ۔ روئے زمین پر کیمیائی ارتقاء ۔ روئے زمین پر زندگی کی نمود۔ زندہ شے کے دوام کا خودکار نظام ۔ توالید ۔ بدلتے ہوئے ماحول سے موافقت ۔ نظریۂ ارتقاء ۔ گذشتہ ارتقاء ۔ علم فلکیات اور قرآن ۔ عقل کا استعمال اور قرآن، جس میں اطلاعاتی تکنیک میں انقلاب سے بحث کی گئی ہے۔

حرفِ آخر کے طور پر ڈاکٹر صاحب اپنی اس عظیم علمی تخلیق کے اختتام پر رقمطراز ہیں:۔

"سوچیے کہ انسانی عقل، غاروں کے زمانہ سے لے کر اب تک کہاں پہنچ چکی ہے۔ وہ قومیں جو عقل کو استعمال کرتی ہیں ان کا دنیا میں کیا مقام ہے۔ وہ قومیں جو جذبات میں ڈوب کر وقت ضائع کر رہی ہیں وہ کس طرح قعرِ مذلت میں گری ہوئی ہیں۔ قرآن کریم کے ارشاد کو پھر سامنے لائیے۔ وہ لوگ جو آنکھیں کھول کر نہیں دیکھتے، کان کھول کر نہیں سنتے، اپنے دماغ سے کام نہیں لیتے وہ چوپاؤں سے بدتر ہیں۔ وہ غفلت میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ لیکن یہ بھی یاد رکھیے کہ عقل کے ذریعے حاصل کردہ سائنس کی ایجادات کو بنی نوع انسان کی مغفرت بخشی اور تعمیری مقاصد کے لیے بھی استعمال کیا جا سکتا ہے اور تخریبی مقاصد کے لیے بھی۔ از روئے قرآن عقل کا صحیح منصب یہ ہے کہ وہ انسان کو نامناسب باتوں سے روکے۔ لیکن اگر جذبات کے تابع ہو جائے تو تباہیوں اور بربادیوں کا موجب بن جاتی ہے اور انسان کے سرکش جذبات اس کی غلط روش کو خوشنما بنا کر دکھاتے ہیں اور اس طرح اسے صحیح روش سے روکتے ہیں۔ جذبات جب عقل پر غالب آجائیں تو انسان کے ذرائع علم بھی اسے کچھ فائدہ نہیں دیتے، جس طرح نشے کی حالت میں انسان نیک و بد کی تمیز نہیں کر سکتا۔

انسانی ذہن اگر اپنے عقلی ارتقاء کے ماحصل کو مثبت اور مفید کاموں کے لیے استعمال کرے تو اس کے لیے تعمیری نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔ لیکن ذہن اگر تخریب کی طرف مائل ہو تو خطرناک نتائج سامنے آتے ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ایٹم کا دور مفید بھی ہے اور نہایت ڈراؤنا بھی۔ اسی طرح **لیزر** سے مفید کام بھی لیے جا سکتے ہیں اور اس سے دشمن کے تیز رفتار مار کرنے والے جہازوں یا میزائلوں کو فضا میں تباہ کرنے یا آبدوز کشتیوں اور ان کے میزائلوں کو پانی میں تہس نہس کرنے کا کام بھی لیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ قرآن نے جذبات، عقل اور وحی کی درجہ بندی کر دی ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ **جذبات کو عقل کے تابع رکھیے اور عقل کو وحی کے تابع رکھیے** پھر دیکھیے کہ انسانی زندگی کی گاڑی کیسے چلتی ہے اور کس رفتار سے چلتی ہے۔

purpose was to collect funds to finance students who deserved to go abroad. There were many prejudices against foreign travel but his own and his son's visit to Europe had been a great stimulation. Gradually prejudices died down.

Such were the views and efforts of Syed Ahmed on this controversial issue. He was clear-headed and he knew exactly where he was heading towards. Herein lay his strength and determination.

–continued–

بقیہ: نقد و نظر از صـ ۶۶

رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا اِنْ نَّسِيْنَا اَوْ اَخْطَاْنَا

اے ہمارے رب! ہماری اس کوشش میں کوئی بھول چوک ہو گئی ہے تو اُس کا مؤاخذہ نہ کرنا۔"

کتاب اعلیٰ ولایتی آفسٹ کاغذ پر چھپی ہے اور دیدہ زیب جلد سے مزین کی گئی ہے۔ اس طرح اس کی صوری حیثیت بھی قابلِ تحسین ہے۔

یہ کتاب ۱۔ خالد پبلشرز، ۵۔ عثمان بلاک نیو گارڈن ٹاون ۔ لاہور ۵۴۶۰۲

۲۔ طلوعِ اسلام ٹرسٹ، ۲۵ بی گلبرگ ۲، لاہور ۱۱۔

اور ۳۔ النّور پرنٹرز و پبلشرز، ۳/۲ فیصل نگر، ملتان روڈ، پوسٹ بکس ۴۱۹۰ لاہور ۔ ۲۵

سے دستیاب ہے۔

---

2 ۔ نوزائیدہ ضلع راجن پور کے قصبہ روجھان میں نظریۂ پاکستان کے تحفّظ کے لیے "ادب و ثقافت" کے نام سے ایک سوسائٹی وجود میں آئی ہے۔ اللّٰہ کرے نظریۂ پاکستان کے یہ بہی خواہ اپنی جدوجہد میں کامیاب رہیں۔

time, and life-secretary after his father's death. This was like disturbing a hornets' nest. A group of old associates led by Maulvi Samiullah Khan left the college and indulged not only in criticism, which is acceptable, but stooped to personal attacks, made an issue of insignificant technical points and thereby "defamed the nation". In his speech on the history of the college in 1889[32] he strongly defended his position. He contended that the purpose of the college was not to produce mere degree holders, which can easily be achieved by Indian teachers. His college was unique in the sense that it did something more than that, and for that European teachers were indispensible. Otherwise the existence of the Muhammadan Anglo-Oriental College was meaningless. There was nothing great in merely adding one more to the list of colleges already established. Moreover, teachers came without formal agreements because formal agreements demand financial guarantees and higher salsaries. For these teachers the only guarantee was Syed Ahmed's name and personality. Such conditions as lower salaries than the government scale and agreements based on friendship could be acceptable to very few. "Only those who have a passion for learning and those who are motivated to help a fallen nation, once powerful and prosperous, to awaken and arise again, are difficult to come by." The present staff fulfilled those conditions and they could only stay on if they were understood and valued on those conditions. This could be possible for the time being if Syed Mahmud remained the guarantee after Syed Ahmed's death. He was experienced and was associated with the college from the beginning.

Syed Ahmed maintained the Trustee Bill in the form he wanted even at the risk of loosing a large number of old associates. He was never so upset before at any opposition, "but", says Hali, "On this ussue if the majority vote of the Board of Trustees had gone against the Bill Syed Ahmed would have withdrawn from the college and the European staff would have left."[33] This episode takes up into the very depths of his educational policy and his main objective in awakening the nation.

Even this was not enough. India still did not provide the right atmosphere and facilities outside the college which is so important for education. So he was very keen that students should go abroad and travel and study in Oxord and Cambridge and other universities of England. There is so much to see there-museums, factories, study circles and universities themselves. All this widens the mental horizons and his objective would be nearer for that.[34] To encourage this he even formed an association in Aligarh in 1877 with himself as Secretary. Its

32 Muqalate - Sir Syed - Volume XII pages 198-232.
33 Altaf Hussain Hali - "Hayate-Javaid" page 333.
34 Muqalate - Sir Syed - Volume VIII pages 142-148.

of our disagreement, we will be very happy. If it does not change in acordance with our wishes, we have no fears, because it has inherent in itself the seeds of its own destruction. "However, Syed Ahmed's writings created a stir in the Punjab and other parts of the north-western province. Some Hindus from the Punjab even published his three articles in the form of a pamphlet and circulated it widely. Ultimately, Syed Ahmed triumphed and the scheme was abandoned. The Punjab University was finally established as a centre of Western learning.

Syed Ahmed's views on western education as against oriental traditional learning would be incomplete without mentioning the role of the European teachers in his scheme of things. He was convinced that the essence of the change that he is attempting to bring about in the mental attitude of people through the medium of western learning would be deficient without being taught by and associating with the European teachers. He was determined to have a European Principal of his College in Aligarh, European warden for the hostel, and at least three lecturers. The core of western attitude would be missed by the Indian teachers no matter how qualified they might be. To adopt the externalia of life and touch the mere periphery could be more damaging to the Indians. He had planned that even the Urdu Section and the Oriental Section of the college be supervised by European professors.Employment of these teachers became an article of faith with him and through the contacts that his son, Syed Mahmud, had made during his study period in London, some great teachers like Dr. Arnold, Walter Raleigh, Theodore Beck and others had been employed. How important this was to Syed Ahmed can be judged from his presentation of and the uncompromising defence, at a big price, of the Trustee Bill. He has been often criticised even by recent commentators for being undemocratic and stubborn and authoritarian. May be so, but his attitude can be understood only in the context of what European teachers meant to him and why. He was ready to go to any length on this issue. He had been anxious from sometime about the future of his college when he was no more. Uptil now, that is, 1889, by a convention the arrangements for European staff were made by Syed Ahmed himself, his son, Syed Mahmud and the Principal of the College, because it is the Principal who has to cooperate with the staff. There was an anxiety among the present European staff that if Maulvi Samiullah Khan, the Honorary Secretary of the Managing Committee succeeded Syed Ahmed as Secretary of the Board of Trustees, they would not be able to cope with the situation, because he did not understand what Syed Ahmed did and was striving for. Also, there was criticism already in the employment of European teachers and the high salaries paid to them. In this background, one of the important clauses of the Trustee Bill was to legalise the convention of the three, Syed Muhamud and the Principal, in relation to appointment of European Staff. It made Syed Mahmud joint Secretary to his father during the latter's life

engineering, judiciary, and even membership of the legislative assembly that is open to them, by reviving and studying dead oriental courses? Since the official language was now English, students of oriental languages would have absolutely no scope as far as jobs are concerned.

This became the most important practical problem. Syed Ahmed gave a graphic description of one instance alone to see the implications of a particular official language. The old native judiciary was the "Sadar Adalat" based on oriental languages and courses. The lawyers, well-versed in these, waxed eloquent. Then came the year 1866 when "Sadar Adalat" was abolished and its place taken by "High Courts" based on European language and courses. The result was that "those who were soaring high like a full grown tree, overnight drooped like a newly planted sappling in a storm. Nobody wants them now, and they can do nothing for themselves, their nation and their country. "Similar was the case in all other departments, and it is interesting to note that no students from the Punjab University College had any access to any jobs. So it is strange that the viceroy was keen to raise the College to the level of an oriental University. He said that one can see the difference in quality-even between those students who had acquired western knowledge but some in English and the others in the native language. The former were far superior. No wonder that the Society established in Calcutta to translate books in native languages are no longer talked about. These books can hardly be traced even. The Delhi College applied itself hard and spent a lot of money on translation and publication. Now those books are sold as waste paper. Syed Ahmed's own efforts through the Scientific Society were not very successful. Thus the Oriental University in the Punjab would not be a novel experiment. It had been tried and had been abandoned as profitless. The bookshop keepers would tell the rest of the tale, the popularity of one and the unpopularity of the other. It is now a truism that oriental studies have failed to educate the nation. They have only produced useless citizens, only adding to the long line of beggars sitting on the ghats of Benares or in orphanages and monastries. Not only that they cannot get jobs, they are not even fit to travel abroad or establish trade centres in different parts of the world.

Of course there was quite a consternation amongst those associated with the Punjab University College at the three critical and forceful articles written by Syed Ahmed. They even accused him of jeolousy and sarcastically reminded him of the early days of the Scientific Society. Syed Ahmed rebutted these charges by saying that in the last two decades political, economic and social conditions have immensely changed and the Scientific Society was established in very different circumstances. Very confidently he declared "If the University does well in spite

(1) Higher Learning and the Government of India.

(2) Our Education in our own Language.

(3) Our Language and Higher Learning.

Some of the points are already familiar to us as they have been discussed above. But some new factors were also brought out and it is worth taking note of them because they are powerfully expressed and very relevant. The main objective of western education, according to Syed Ahmed, from the very beginning, was to awaken his people. It was inherent in western literature and sciences that it changed the attitude of the people and made them foreward looking and vigorous. Already it was giving them new ideas. In his second article[30] he says "western education has indeed created political consciousness resulting in political agitation. There has been a great deal of criticism of the government as well, both fair and unfair."This shows that the government was becoming rather nervous because of this development, and hence the Viceroy's speech in favour of stagnant oriental studies. Syed Ahmed added that the government should understand that "these very critics are also the ones who truly value the good done by the English Government. Indeed to give us B.A. and M.A. degrees and then to expect us to live on the level of a child is not acceptable to us. "The impact of western education as such is pointed in the first paragraph of the first article.[31] "There was a time when noteworthy politicians were of the view that there is no better policy than not to impart higher modern knowledge and the English language to the Indians if they are to be kept subjected and not allowed to advance beyond the stage of barbarism. "This is the quintessence of his understanding of the problem as an educationist and the reason why he so strongly advocated the absorption of western attitude. Thus, according to him, the Punjab University College as a centre of oriental studies had been an obstacle to progress. To raise it to the level of a University would indeed be a calamity for the national development of the country. Of course the people would feel that they are being favoured by introducing oriental studies, but it is a sheer deception. No matter in what sweet words it is couched, the fact remains that the objective would be to keep Indians enslaved.

Emphasising again and again that "National power and national development are like twin sisters" and that a language could never flourish without political backing, he questioned as to whether Indians could participate and take advantage of the various services like the civil service, medicine, law

30 Muqalate - Sir Syed - Volume VIII pages 34-41.

31 ibid pages 29-33.

There were other arguments too in favour of European languages, and particularly English in this case, because Indians were in direct contact with this language only. According to Syed Ahmed "there is not a single example in the history of mankind when knowledge developed in the language other than the language of the ruler."[26]

The implication of this thesis is that the language must be backed by political power. The language that rules flourishes. For instance, says Syed Ahmed, during the Ummayad and Abbasid period Arabic flourished; everbody desired to learn the Arabic language. During the Hindu period in India, Sanskrit flourished and people acquired only this language. During the Muslim period, or the Turko-Mughul rule, Persian was in ascendance. Now the English rule over the sub-Continent and there is no way out but to adopt the Enlish language.[27] The language of the ruler becomes so important that even day to day life is effected by it. Even simple occasions like buying a ticket at the railway station, finding out the entrance or the exit to the platform and boarding the right train can confuse the people unnecessarily if they do not know English.[28] This is indeed a realistic view of the situation, howsoever unpleasant it may be to the subject people. At the same time he urged them to continue studying the Persian and Arabic languages for that is the way to keep in touch with the past history and the past classics.

Time proved Syed Ahmed right. We have already seen that he had also planned a secular Oriental Department for his college in Aligarh with Urdu as the medium of instruction. It was soon realised that in the face of practical purposes it proved to be useless . The department just withered away and it had to be shut down because at one stage there were more teachers than students:

What Syed Ahmed was trying to get across was further crystallised on the issue of the Punjab University College in Lahore. In 1881 the Viceroy, Lord Lytton made speeches in the Punjab in favour of oriental studies as being more feasable in India. There was an indication that the college would be raised to the status of an Oriental University. This came as a big shock to Syed Ahmed and it appeared as if he had lost his patience.[29] He wrote three articles against such a possibility with a great deal of emotions and arguments. the three articles were captioned as follows:-

---

26 Muqalate - Sir Syed - Volume XII page 275.
27 Muqalate - Sir Syed - Volume VIII pages 4-5.
28 Khutbat-e-Sir Syed - Volume II page 360.
29 Altaf Hussain Hali - "Hayate Javed" page 462.

relationship between the ruler and the ruled are impossible without the English language. "[22] In fact even the translated books were not read and valued by the people, for there were not many who could read and understand. This lack of interest even created financial problems for paucity of funds. He made this frank confession, the failure of the Urdu language as a medium of higher learning, before the Education Commission as well, in 1882.

Having realised the virtual failure of the Scientific Society Syed Ahmed took up cudgels in the defence of the English language. He tried to convince his people that higher learning is impossible without the English language. The major factor in his own metamorphosis on this issue seems to be the colossal number of books to be translated, and the continuous additions made to them day after day on the basis of discoveries and constant research in every field. He referred to the oft-quoted example of the Abbasid Empire under Haroon and Mamoon. In a speech delivered in Jullundur in 1894 he said that the days of Haroon and Mamoon are past and gone. They established bureau of translation and did a very useful work. But "if there were ten books then, there are thousands now, without which we can neither be learned nor gain respect. We are helpless in this."[23] In 1896 in Meerut he challenged those who still believed that development was possible in the mother-tongue only. He said although translation of books is a good thing, it is not practicable. "Even ten empires of Haroon and Mamoon cannot cope with the translation today."[24] In modern times, Egypt made a serious effort at good translation of some very useful books. But Syed Ahmed warned that "by the time these books were translated and introduced in the courses, knowledge had advanced so much that the translated books became outdated..... so much is being discovered and written day and night that it is dificult to comprehend. Unless the language itself is developed enough, and enough research is being done through it, higher education cannot be acquired in it."[25] It is a very important and difficult problem he was grappling with. The big chasm created through the centuries between the post-Renaissance Europe and the non-European world that went to sleep has created all sorts of challenging problems, the essence of which is the inadequacies of the native languages of the subject people. A hundred years later, the problem still defies solution and the ex-colonies have not been able to totally get rid of the European languages. They can only do so by becoming a dynamic expression of a dynamic people.*

22 Muqalate - Sir Syed - Volume XII pages 187-188.
23 Khutbat-e-Sir Syed - Volume II pages 274-275.
24 ibid pages 380-381.
25 Muqalate - Sir Syed - Volume VIII 159.

(2) How can one language, and that too an alien one, be imposed on crores of people?

(3) Education would be much more effective, accessible and understandable if it is in the vernacular.

(4) A lot of time is lost in merely acquiring the foreign language, and even then very few can use it well for education and other purposes. Englishmen themselves would find it difficult if they were to use a foreign language.*

(5) Having acquired knowledge in Urdu, students will be urged to read in the original language.

(6) If a student studies only in English he will not be able to communicate with others because of his unfamiliarity with the terminology in Urdu.

While putting across these points Syed Ahmad clearly emphasised that "our aim is not to revive oriental studies but only to use the native language as medium of instruction and expression. We actually wish to study European subjects in order to awaken our people. "Then he gave examples of Roorki Engineering College and medical college of Agra, where both languages were being used. It is the Urdu medium "that would considerably widen the circle of educated people."

As for the text books they can be translated,and as it is, the Scientific Society is already attempting it.

However, the government rejected the presentation on the plea that (1) Urdu does not have adequate resources. Text books alone are not enough, research means that much more than text book should be made available to the students. (2) The Government does not have enough financial resources to educate the whole country. Thus did Syed Ahmed's plan come to nought. But in the mean-time he was also changing his own views on the subject. The very experience with the Scientific Society educated him in favour of the English language. He admitted this in his speech on the History of Muhammadan Anglo-Oriental College in 1889. "In those days I thought" he said, "that I could make my people acquainted with higher European learning through translations in Urdu. In my efforts towards it I established a Scientific Society. It did translate quite a few books....... I do not deny that this has proved useful for the country, but I am now convinced that highter learning, social development and better

Urdu Language. Thus in 1864 he inaugurated a "Translation Society", later known as "Scientific Society", to translate * literary and knowledgeable books from English to Urdu so that his countrymen became acquainted with and interested in western literature and learning. [17]The Society, with Syed Ahmed himself as its Honorary Secretary, worked hard and earnestly to translate books. To begin with history formed an important part of the programme, for according to Syed Ahmed understanding of past events helps the progress of a nation. History books included Elphinstone's "History of India", Rollin's History of Ancient Egypt and History of Ancient Greece, and Sir John Malcolm's History of Persia. Other books were Mill's Political Economy, Senior's book on Political Science and Scott Burn's book on agriculture. The society also issued a "Scientific Society Magazine later known as "Aligarh Institute Gazette", regularly published till the end of Syed Ahmed's life. It printed articles of high academic standard and re-produced learned lectures that were organised by the Society. Sir William Miur, the then Lt. Governor of the North Western Province encouraged these efforts and even gave government aid. [18]Quite a few societies sprung up in other towns as an inspiration from Syed Ahmed's efforts.[19]

Once speaking at the Benares Institute in 1867[20] he spoke in defence of translating books and gave the example of Peter the Great of Russia. He got books translated in his own language so much so that by 1813, thirteen thousand, two hundred and forty-nine books had been translated. Giving these statistics he argued: "Only those nations can develop their culture and * Civilisation whose total source knowledge is in their own language. Any nation that decided to progress got all the existing books translated in its own language.....That is the only way to become cultured. "It was in keeping with this view, that Syed Ahmed made a presentation to the government on behalf of the British Indian Association (founded by himself in 1866 to present Inian grievances in an organised way) in 1866 for the establishment of a vernacular University.[21] This presentation is useful in that it clarifies further his views in defence of the Urdu language. His arguments are as follows:-

(1) English as medium of instruction should be retained, but in addition to it Urdu should also be the medium, because in English alone very few people will benefit.

17 Altaf Hussain Hali - "Hayate-Javaid" page 397.
18 Ibid page 398.
19 ibid page 398.
20 Khutbat-e-Sir Syed - Volume I pages 130-145.
21 Muqalate - Sir Syed - Volume VIII pages 51-71.

religious readings, Hunter says, consists mainly of "Muhammadan Traditions (Hadith)and law-books of fanatical medieval stamp - a sort of learning which fills the youthful brain with windy self-importance, and gives rise to bitter schisms on the most trivial points within the College walls."[14] It was against the uselessness of this fanatical, obscurantist, scholastic conceited and unscientific teaching (if it can be described as teaching at all) that Syed Ahmed led a crusade. For him it became a matter of life and death of the nation. Desperately he questioned: what are students capable of after going through such books and such teaching? of what use is it going through meaningless quibbling of words, divorced from modern realities? Should not the people judge for themselves the value of such courses? It benefits neither the country nor the individual concerned. What discoveries have they made about this beautiful universe full of so much wisdom and excellence? Syed Ahmed writes that a relative of a friend of his, who had studied at Deoband, was awarded the "turban of honour " after completing its traditional courses. He now wanted to know as to what he should do next! Indeed! what could he do except sit in a mosque and preside over funeral ceremonies, and eat charity-meals, and wonder and remember the words he used to meaninglessly twist when at Deoband.[15] This is generally the fate of students having gone through traditional courses. They became professional beggars. They are not qualified for anything in this life. Thus traditional education which is rigid and atrophied must be given up and knowlege must be sought in European books. With traditional books must go the traditional system of schools. These schools are more like orphanages, attached to mosques or some charitable institution, that survive on small and uncertain monthly donations, and where old decrepit teachers make an attempt to teach and live on charity meals. No self-respecting and vigorous nation can be moulded from such a system. What the nation needs are well-established and well-financed modern schools and colleges.

An integral part of the controversy between the Orientalists and the Anglicists was the question of language, the medium of expressing knowledge. As far as acquiring acquaintance with the English language is concerned Syed Ahmed had definite opinions. As early as 1863 he spoke to the Muhammadan Literary Society in Calcutta on prejudices against the English language. "No religious prohibitions stand in the way of our learning any language spoken by any of the many nations of the world.[16] But learning a language is one thing, to make it a medium of instruction and learning is another. In these early post-"Mutiny" years he believed that western knowledge should be acquired in the

14 Ibid page 176.
15 Khutubat-e-Sir Syed - Volume I pages 262-264.
16 Muqalat - e - Sir Syed - Volume XII pages 285-299

begun, advances on and on, it cannot stop. Moreover it travels from one country to another, one civilization to another - from Egypt into Greece, from Greece into Arabia, from Arabia and Arab Spain into Europe, from Europe into Russia and the rest of the non-European world.

After all said and done, Greek knowledge was not perfect and without mistakes. The mistakes have been now discovered and rectified. What is beneficial for Muslim India? "To follow the beaten path of the Greeks that leads us nowhere, or modern knowledge that leads us to prosperity and respect? "[11]

Courses taught in the traditional schools wasted the energies and time of the students. They covered long and varied courses that were completely outdated; They were Grammar, Rhetorics, Literature, Logic, physics, astronomy, mathematics, scholasticism, law, jurisprudence, commentary on the Hadith, medicine and geography. For more than five hundred years the courses had remained stagnant and divorced from the realities and the discoveries made in other parts of the world. The students were still taught that there were three continents and that the world was stationery. As for Arabic and Persian literature, it "is full of peurilities, amorous themes, indecent tales, false praises of kings and nobles and exercises in rhymed writing with fine words but no meaning. It can produce no good effect on a man's heart and morals. It stimulates no natural faculty of his. Its reader knows from the very start that it is all lies, exaggeration, poetic trickery and literary artifice. So it leaves him cold .... Propagating literature of this kind is not doing any favour to us, but pushing us deeper into the darkness in which we have been groping for centuries. "[12] No wonder that Syed Ahmed believed that no Governor-General and Viceroy of India had done more for the welfare of Indian than Lord Macaulay through his Minutes. He was inclined to agree with him that oriental books were on the whole irrational and nonsensical. While the books taught had such scandalous information, the mode of teaching was even more unscientific and useless. Talking of the Calcutta Muhammadan College which had been practically left in the hands of the Muhammadans, Hunter says: "At the end of seven years the students knew certain books by heart, text and interpretation, but if they get a simple manuscript beyond their narrow curriculum, they are in a moment beyond their depth. Such teaching, it may well be supposed, produces an intolerant contempt for anything which they have not learned. The very nothingness of their acquirements makes them more conceited. They know as an absolute truth that the Arabic grammar, law, rhetoric, and logic, comprise all that is worth knowing upon earth."[13] The

11 Khutubat-e-Sir Syed - Vol: I pages 378-379.
12 Muqalat - e - Sir Syed - Volume XV pages 59-60.
13 W.Hunter - "The indian Mussalmans" page 177.

knowlege has grown and grown while we were asleep, and we would then go forth to learn from whichever nation that has accomplished the most and the best."[6] Having shown all the respect he could for the ancestors, he declared that "ancient science and philosophy was badly outdated compared to modern knowledge. "[7] The nineteenth century Muslim India could not depend upon it alone. It must acquire latest knowledge in all fields.

Syed Ahmed had another view of looking at oriental studies. Almost all branches of the existing oriental knowledge were traced back to the Greeks. When the Arabs rose to power they willingly and most avidly read the Greek writers and adopted their knowlege and made it their own. If they, that is, the Muslims could do it once why cannot they do it again? If it can be all right to study and accept Greek knowledge then what prevents them from studying Europeen knowlege today? How can Greek learning, no matter how excellent, be the end? Europe has progressed far ahead since those days, and Muslims must take cognisance of this fact. It can be ignored only at their peril. This approach is particularly seen in his attitude towards the Ulemas as a class. The Ulemas in the past had rejected Greek methods to begin with. But later had attempted to survive by finding justificatory reasons in Greek logic and philosophy. This is how they evolved "Ilmul-Kalam."[8] Syed Ahmed argued that if they could meet the Greek challenge thus, why cannot they do so now by using modern European logic and philosophy? Accordingly he wrote a letter to the Secretary of Nadvatual-Ulema who were holding their meeting in Cawnpore, and asked him to present the letter at the meeting. He wrote: "It is no use prohibiting it (European knowledge) as "haram",[9] this approach did not work in the past, it is not going to work today..... Commentaries on the Quran and Hadith based on Greek philosophy are not adequate to meet the challenge of the modern world. The result is that people are turning away from it (the commentaries). This is a dangerous trend and it will continue to gain in strength. So please present my letter to the Ulema. "[10] But the letter was not presented at the meeting and the Ulema gave no attention to this problem. But that is another story. He continued to emphasie till the end that the system of traditional education is useless. The revival of this system in several schools established in Jaunpur, Aligarh, Cawnpore, Saharanpur, Deoband, Delhi and Lahore served no purpose. Is old knowledge enough? He asked again and again. Has medicine, surgery, pharmacy, philosophy, mathematics, literature etc. not gone far ahead from the point where the ulema stood? Knowledge once

6 Khutubat-e-Sir Syed - Volume I pages 136-137.
7 ibid page 77.
8 Scholasticism.
9 Forbidden according to Divine Command.
10 Khutubat-e-Sir Syed - Volume I pages 297-298.

nation.

One thing is worth mentioning here. While he lashed out at the past, he took into consideration the feelings of the people and their hurt pride as the erstwhile rulers of the subcontinent. Their identity was with the past, and this identity alone was responsible even for their mere physical existence. For instance he once declared: "To be proud of ones forefathers, but to be nothing oneself is only to stigmatise them. "[3] Again: "It is frustrating that this nation glorifies its ancestors but does not do anything herself. What could be more disrespectful and dishonourable than defaming ones ancestors by its present condition/the most ignorant, the most degraded, the most contemptuous, the most poverty-stricken."[4] Thus Syed Ahmed recognised that the ancestors may have been knowledgeable and powerful, they may be all that makes one proud, but then, we can only be proud if we are like them today. A nation has to perpetually go on marching into time, highter and higher, each generation making its own contribution towards culture and civilisation. It is fatal and a disgrace to that very past that one is so proud of, to stop at a certain point and start living on the laurels of the ancestors. It was from this angle that Syed Ahmed urged his people to realise the defects of the traditional education based on oriental studies, and compare it with modern achievements. His favourite simile was that of a "seed" and a "full-fledged blooming tree." The ancestors were supposed to have sown the seed of knowledge, but it is the present generation of Europeans who have nourished it into a tree. "There was a time," he wrote, "When our books were considered knowledgeable, but it must now be found out how far knowledge has advanced today. The seeds that our ancestors sowed are now strong, fruitful trees. They are so fully laden with flowers and fruits and its branches are so beautiful with delicious fruit that they appear to be something very new and something that did not exist during the time of our forefathers. Whatever the fore-fathers possessed was in the form of seeds, now they have grown into trees. Now, to be proud of the seeds, but to shun the trees and to deprive oneself of the delicious fruits wil not benefit us nor give us respect."[5] Carrying on this argument further, he maintained that if our ancestors were living today, they would be as creative as they were then and would not have stopped their activities as we have. They created then, they would create now. "Ancestors had added to the knowledge of their own ancestors, and beautified what they had inherited by their own creativity. If they were living today they would do the same and move on to the road to development and excellence. But we have done nothing; we have in fact even lost what we had. If we would realise how

3 Khutabat-e-Sir Syed - Volume I page 455.
4 Muqalat - e - Sir Syed - Volume XII page 121.
5 Muqalat - e - Sir Syed - pages 154-156.

— continued from JUNE 1988 —

CHAPTER VI

WESTERN EDUCATION VERSUS TRADITIONAL EDUCATION.

The Oxford History of India states: "Before 1813 the conservative vein was generally ascendant; between 1813 and 1828 the conservative and liberal veins contended and precept was more prominent than practice; from 1828 the liberal view gathered strength though tempered by caution and the limits of available resources."[1] This was true both in the social and educational fields. Before 1813 some western scholars had evinced great interest in oriental studies and had taken steps to revive and encourage it. Calcutta Madrassa and Bengal Asiatic Society were the outcome of this interest and Sir William Jones, scholar of Sanskrit language, William Wilkins, the Persian Scholar and Horace Hayman were the leaders of this movement. Also Able Reynal and James Forbes thought that the ancient ways of life had their own merit and that their thought had depth. They were the backward looking orientalists. From 1813 onwards, the foreward looking group, who came to be known as Anglicists, contended the above view. Adam Smith and Jeremy Bentham led by James Mill attacked ancient logic, philosophy, and institutions. "Mill found little good in Indian institutions; reason lay dormant beneath the debris of centuries; Indian thought was peurile, its religion superstitious, its customs hidebound or harmful. The remedy was to introduce reason and European knowledge. Indians would see the light and reform themselves."[2] While the Anglicists argued thus, the Orientalists were busy founding Sanskrit College (1824) in Calcutta and Arabic College (1825) in Delhi. However, in the meantime, the policy laid down by the Charter Act of 1813 and the sum of one lac rupees allotted for educational purposes was held up in the controversy. Eventually Macaulay's Minutes of 1835 and Lord Bentick's Resolution based on it decided in favour of western knowledge through the medium of the English Language. Anglicists had triumphed over the Orientalists. Among a group of Indians who welcomed this decision, Syed Ahmed was the most noteworthy. He was one of those who saw the light and was determined to reform his people. He became, as one of the leading Indian educationalists, a bold and severe critic of the old traditional, oriental education, its institutions and mode of imparting knowledge. His articles and speeches hammered into the minds of the people its decadent and stagnant features and forcefully and enthusiastically and above all, with basic human pathos and concern, advocated western education, if they, his people, were to survive as a respected, living

1 V.Smith - "The Oxford History of India." page 647.
2 ibid - page 646.